# تدبرِ قرآن

۲۷

# النّمل

بسم اللہ الرحمن الرحیم

## ا۔ سورہ کا عمود اور سابق سورہ سے تعلق

سابق سورہ میں یہ حقیقت واضح فرمائی ہے کہ یہ قرآن کوئی شاعری اور کہانت نہیں ہے بلکہ اللہ کا اتارا ہوا کلام ہے لیکن جو لوگ اس پر ایمان نہیں لانا چاہتے وہ اس کے انذار کا مذاق اڑا رہے ہیں۔ ان کا مطالبہ یہ ہے کہ قرآن ان کو جس چیز سے ڈرا رہا ہے جب وہ اس کو دیکھ لیں گے تب اس پر ایمان لائیں گے اور اللہ تعالیٰ یہ چاہتا ہے کہ وہ عذاب کو دعوت دینے کے بجائے رسولوں اور ان کے جھٹلانے والوں کی تاریخ سے سبق حاصل کریں۔ اس سورہ میں یہ واضح فرمایا ہے کہ اس کتاب کو اللہ تعالیٰ نے ہدایت و بشارت بنا کر نازل فرمایا ہے لیکن اس پر ایمان وہی لائیں گے جن کے دلوں کے اندر آخرت کا خوف ہے۔ جو لوگ اس دنیا کے عیش و آرام میں مگن ہیں وہ اپنے ان مشاغل سے دستبردار نہیں ہو سکتے جن میں وہ مشغول ہیں۔ ان کے اعمال ان کی نگاہوں میں اس طرح کھبا دیے گئے ہیں کہ اب کوئی تذکیر و تنبیہ بھی ان پر کارگر نہیں ہو سکتی۔ پچھلی سورہ میں بحث کی بنیاد صفاتِ الٰہی میں سے صفات — عزیز و رحیم — پر رکھی ہے جن کے تمام پہلوؤں کی وضاحت ہم کر چکے ہیں۔ اس سورہ کی بنیاد صفات — حکیم و علیم — پر ہے کہ یہ قرآن خدائے حکیم و علیم کا اتارا ہوا ہے تو وہ جو کچھ کرے گا وہ حکمت اور علم پر مبنی ہوگا۔ پیغمبر اور ان کے ساتھیوں کو اپنے رب حکیم و علیم پر بھروسہ رکھنا چاہیے کہ وہ ان کو اچھے انجام سے ہمکنار کرے گا۔

## ب۔ سورہ کے مطالب کا تجزیہ

(۱-۶) سورہ کی تمہید جو سورۂ بقرہ کی تمہید سے ملتی جلتی ہوئی ہے۔ اس میں واضح فرمایا ہے کہ یہ قرآن بجائے خود نہایت واضح اور عقل و دل کو اپیل کرنے والی کتاب ہے، لیکن جو لوگ آخرت کو نہیں ماننا چاہتے وہ اس پر ایمان نہیں لائیں گے۔ وہ جن دلچسپیوں میں منہمک ہیں شیطان نے ان کی نگاہوں میں وہ اس طرح کھبا دی ہیں کہ اب وہ ان کے پیچھے اندھے ہو چکے ہیں۔ وہ اسی طرح بھٹکتے رہیں گے۔

(۷-۱۴) حضرت موسیٰؑ کی سرگزشت کا ابتدائی حصہ جس میں یہ واضح فرمایا ہے کہ اللہ نے ان کو نہایت واضح نشانیوں کے ساتھ فرعون کے پاس رسول بنا کر بھیجا لیکن فرعون اور اس کی قوم نے یہ یقین کرنے کے باوجود کہ یہ خدائی نشانیاں ہیں حضرت موسیٰؑ کی رسالت تسلیم نہیں کی اور بالآخر وہ ہلاک ہو کر رہے۔

(۱۵-۴۴) اللہ تعالیٰ کے صالح و مصلح بندوں کا ذکر کہ نعمت ان کو اندھا نہیں بناتی بلکہ جتنا ہی ان نعمتوں میں اضافہ ہوتا جاتا ہے اتنی ہی منعم حقیقی کے آگے ان کی فروتنی اور سرافگندگی بڑھتی جاتی ہے۔ حضرت داؤدؑ اور حضرت سلیمان علیہما السلام

پراللہ تعالیٰ کے جو انعامات ہوئے ان میں سے بعض کا حوالہ جن سے واضح ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نعمت و جاہ اور حکمت و سائنس میں سے جو کچھ ان کو بخشا وہ کسی کو بھی نہیں بخشا لیکن انھوں نے ہر نعمت کو اللہ کا فضل جانا اور یہ حقیقت ہمیشہ پیش نظر رکھی کہ یہ نعمتیں دے کر اللہ تعالیٰ ان کا امتحان کر رہا ہے کہ وہ اس کے شکر گزار بندے بنتے ہیں یا ناشکرے۔

(۴۵-۵۳) مفسدین فی الارض کے انجام کو واضح کرنے کے لیے قوم ثمود کی مثال کا حوالہ۔ پچھلی سورہ میں بھی ان کے فساد فی الارض کا ذکر گزر چکا ہے۔ اس سورہ میں اس کی مزید وضاحت ہوئی ہے کہ ان کی جمعیت بہت بھاری تھی۔ ان کے نو نہایت جنگجو قبائل تھے اور یہ برابر جنگ و فساد میں سرگرم رہتے تھے۔ حضرت صالحؑ نے ان کی اصلاح کی کوشش کی لیکن انھوں نے نہ صرف یہ کہ ان کی بات سنی نہیں بلکہ ان کے قتل کے بھی درپے ہو گئے۔ بالآخر ان پر اللہ کا فیصلہ کن عذاب آیا اور ان کی پرشوکت تعمیرات، جن پر ان کو ناز تھا، کھنڈروں کی شکل میں تبدیل ہو گئیں۔ ان کھنڈروں کے آثار قریش کی عبرت کے لیے موجود تھے۔

(۵۴-۵۸) قوم لوط کی سرگزشت کی طرف اجمالی اشارہ۔ حضرت لوطؑ نے ان کے اخلاقی فساد کی اصلاح کی کوشش فرمائی اور اس کے برے انجام سے ان کو ڈرایا لیکن وہ ان کی بات سننے کے بجائے ان کو اور ان کے ساتھیوں کو اپنے اندر سے نکال دینے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے کہ یہ لوگ بڑے پارسا بنتے ہیں کہ ہمیں نصیحت کرنے اٹھے ہیں۔ بالآخر ان پر بھی خدا کا عذاب آیا جس نے ان کو نیست و نابود کر کے رکھ دیا۔ ان کے آثار پر سے بھی قریش کو اکثر گزرنے کے مواقع ملتے رہتے تھے۔

(۵۹-۶۸) اس کائنات کی گوناگون نشانیوں اور نعمتوں میں سے ایک ایک کی طرف اشارہ کر کے مخاطبوں سے سوال کہ ان میں سے کس چیز کو تم خدا کے سوا کسی اور کی طرف منسوب کر سکتے ہو؟ جب ان میں سے کسی چیز کو بھی خدا کے سوا کسی اور کی طرف منسوب نہیں کر سکتے تو آخر اللہ کے سوا دوسری چیزوں کی کیوں پرستش کرتے ہو اور ان کے بل پر اللہ اور اس کے رسول سے کیوں لڑنے اٹھ کھڑے ہوئے ہو! آخر میں اس بات کی طرف اشارہ کہ جہاں تک شرک اور شرکا کا تعلق ہے ان کے حق میں تو کوئی دلیل یہ پیش نہیں کر سکتے لیکن آخرت کے معاملے میں یہ سخت تضاد فکر میں مبتلا ہیں۔ اس کو یہ محض اگلوں کا افسانہ کہتے ہیں اور یہی چیز درحقیقت ان کی ساری سرکشی کا سبب ہے۔

(۶۹-۹۳) خاتمۂ سورہ، جس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی گئی ہے کہ نہ ان کے حال پر غم کرو، نہ ان کی چالوں سے پریشان ہو۔ اگر یہ عذاب کا مطالبہ کر رہے ہیں تو ان سے کہہ دو کہ جو مہلت ملی ہوئی ہے اس پر اللہ کا شکر کرو، اپنی شامت نہ بلاؤ۔ تم اپنا فرض ادا کر دو۔ اگر یہ نہیں سنتے تو تمہارا کام مُردوں اور بہروں کو سنانا نہیں ہے۔ تم یہ اعلان کر دو کہ مجھے اسی قرآن کے سنانے کی ہدایت ہوئی ہے۔ جو اس پر ایمان لائے گا اس کا نفع اسی کو پہنچے گا اور جو اس کا انکار کرے گا اس کی ذمہ داری مجھ پر نہیں ہے۔ میں صرف ایک منذر ہوں۔ لوگوں پر کوئی داروغہ مقرر کر کے نہیں بھیجا گیا ہوں۔

---

# سُورَةُ النَّمْلِ (۲۷)

مَكِّيَّةٌ ــــــــــــ اٰيَاتُهَا ۹۳

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

آیات ۱-۶

طٰسٓ تِلْكَ اٰيٰتُ الْقُرْاٰنِ وَكِتَابٍ مُّبِيْنٍ ﴿١﴾ هُدًى وَّبُشْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ ﴿٢﴾ الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ ﴿٣﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ زَيَّنَّا لَهُمْ اَعْمَالَهُمْ فَهُمْ يَعْمَهُوْنَ ﴿٤﴾ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ لَهُمْ سُوْٓءُ الْعَذَابِ وَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ هُمُ الْاَخْسَرُوْنَ ﴿٥﴾ وَاِنَّكَ لَتُلَقَّى الْقُرْاٰنَ مِنْ لَّدُنْ حَكِيْمٍ عَلِيْمٍ ﴿٦﴾

الثلثة

ترجمۂ آیات ۱-۶

یہ طٰسٓ ہے۔ یہ قرآن اور ایک واضح کتاب کی آیات ہیں۔ یہ ہدایت و بشارت ہے ان ایمان لانے والوں کے لیے جو نماز کا اہتمام کرتے اور زکوٰۃ دیتے ہیں اور وہی ہیں جو آخرت پر یقین رکھتے ہیں۔ ۱-۳

جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے ہم نے ان کے اعمال ان کی نگاہوں میں کھبا دیے ہیں پس وہ بھٹکتے پھر رہے ہیں۔ یہ لوگ ہیں کہ ان کے لیے دنیا میں بھی برا عذاب ہے اور آخرت میں وہی ہیں جو بڑے خسارے میں ہوں گے۔ اور بے شک یہ قرآن تم کو ایک

حکیم و علیم کی طرف سے تعلیم کیا جا رہا ہے۔ ۴-۶

## ۱۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

طٰسٓ تِلْكَ اٰيٰتُ الْقُرْاٰنِ وَكِتَابٍ مُّبِيْنٍ ۝ (۱)

'طٰسٓ' یہ اس سورہ کا قرآنی نام ہے۔

قرآن اپنے دعوے پر خود حجت ہے

'تِلْكَ اٰيٰتُ الْقُرْاٰنِ وَكِتَابٍ مُّبِيْنٍ'۔ لفظ 'قُرْاٰنٌ' کتاب آسمانی کے لیے معروف ہے اس کے ساتھ 'کِتَابٍ مُّبِيْنٍ' کی صفت اس حقیقت کو ظاہر کر رہی ہے کہ یہ اپنے ہر دعوے پر خود ایسی حجت ہے کہ اس کی صحت و صداقت کو جانچنے کے لیے کسی خارجی شہادت اور کسی معجزہ و نشانی کی ضرورت نہیں ہے یہ صفت یہاں اس کے ان معترضین و مخالفین کو سامنے رکھ کر لائی گئی ہے جو اس کی تصدیق کے لیے کسی نشانی کا مطالبہ کر رہے تھے۔ یہاں ان دونوں لفظوں نے اس کی عظمت کے پہلو کو بھی واضح کر دیا ہے اور اس کی حجت کے پہلو کو بھی۔ مطلب یہ ہے کہ یہ خدا کا اتارا ہوا قرآن ہے کوئی مذاق و استہزا کی چیز نہیں ہے اور اتمام حجت کے پہلو سے یہ خود اپنے وجود کے اندر مکمل ہے تو جو لوگ اس کو ہنسی مسخری میں ٹالنا چاہتے ہیں وہ سوچ لیں کہ ان کی اس حرکت کے نتائج کیا کچھ نکل سکتے ہیں!

هُدًى وَّبُشْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ ۝ الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ (۲-۳)

قرآن ہدایت و بشارت ہے

یعنی اس کے مخالفین اس کی قدر کریں یا نہ کریں لیکن یہ کتاب ان لوگوں کے لیے ہدایت و بشارت بن کر نازل ہوئی ہے جو اس پر ایمان لاتے ہیں۔ ان کو یہ زندگی کی صراط مستقیم کی طرف رہنمائی بھی کر رہی ہے اور دنیا اور آخرت دونوں میں فوز و فلاح کی بشارت بھی دے رہی ہے۔ اقامتِ صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ کا ذکر یہاں ان اہل ایمان کی جامع صفت کی حیثیت سے ہوا ہے۔ ہم دوسرے مقام میں ذکر کر چکے ہیں کہ ان دونوں چیزوں کی حیثیت دین میں تمام نیکیوں کے شیرازے کی ہے، خواہ وہ حقوق اللہ سے تعلق رکھنے والی ہوں یا حقوق العباد سے۔ ان کا ذکر ہو گیا تو گویا سب کا ذکر ہو گیا۔

جو لوگ آخرت کا یقین رکھتے ہیں وہی اس قرآن پر ایمان لائیں گے

'وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ' میں حصر اور تاکید کا اسلوب بیان اس حقیقت کی طرف اشارہ کر رہا ہے کہ جو لوگ نماز اور زکوٰۃ کا یہ اہتمام کر رہے ہیں درحقیقت وہی لوگ آخرت پر یقین رکھنے والے ہیں اور اسی چیز نے ان کو اس کتاب پر ایمان لانے کی توفیق بخشی ہے۔ رہے وہ لوگ جن پر یہ چیزیں شاق ہیں تو وہ آخرت کے یقین سے محروم ہیں اور اس قسم کے لوگ اس کتاب پر ایمان سے محروم ہی رہیں گے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ زَيَّنَّا لَهُمْ اَعْمَالَهُمْ فَهُمْ يَعْمَهُوْنَ (۴)

منکرینِ قرآن کا سببِ انکار

یہ منکرین کے اصل سببِ انکار کی طرف اشارہ ہے کہ جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے ہیں بلکہ اسی دنیا کی زندگی کو کل زندگی سمجھے ہوئے بیٹھے ہیں، ان کی نگاہوں میں ان کے اعمال اس طرح کھبا دیے گئے ہیں کہ اب ان سے ہٹ کر کچھ سوچنے سمجھنے کے لیے وہ تیار نہیں ہیں۔ یہ اس سنتِ الٰہی کی طرف اشارہ ہے جس کی وضاحت اس کتاب میں جگہ جگہ ہو چکی ہے کہ جو لوگ اسی دنیا کو مقصود و مطلوب بنا کر اپنی تمام ذہانت و قابلیت اسی کی طلب میں لگا دیتے ہیں، اللہ تعالیٰ ان کے اعمال و مشاغل کو اس طرح ان پر مسلط کر دیتا ہے کہ پھر نہ وہ ان کے چھوڑنے ہی پر آمادہ ہوتے اور نہ ان سے چھوٹ ہی سکتے۔ وہ انہی کے اندر بھٹکتے رہتے ہیں یہاں تک کہ ایک دن فرشتۂ اجل آکر ان کو دبوچ لیتا ہے۔

اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ لَهُمْ سُوْٓءُ الْعَذَابِ وَهُمْ فِى الْاٰخِرَةِ هُمُ الْاَخْسَرُوْنَ (۵)

مکذبینِ رسول پر اس دنیا میں بھی عذاب آیا

اس آیت میں عذابِ آخرت کا چونکہ مستقلاً ذکر ہے اس وجہ سے قرینہ دلیل ہے کہ 'سُوْٓءُ الْعَذَابِ' کا تعلق عذابِ دنیا سے ہے۔ یہاں ذکر مکذبینِ رسول کا ہے اور مکذبینِ رسول پر اس دنیا میں بھی، جیسا کہ ہم اس کے محل میں ذکر کر چکے ہیں لازماً عذاب آتا ہے اس وجہ سے فرمایا کہ ان کے لیے دنیا میں بھی برا عذاب ہے اور آخرت میں بھی۔ 'وَهُمْ فِى الْاٰخِرَةِ هُمُ الْاَخْسَرُوْنَ' میں اسی طرح حصر اور تاکید کا اسلوب ہے جس طرح اوپر 'وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ' میں گزر چکا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ان لوگوں نے ساری زندگی چونکہ دنیا ہی کو مطلوب و مقصود بنا کر گزاری، آخرت کا ان کو کبھی دھیان ہی نہیں آیا، یہاں تک کہ اسی دنیا کے عشق میں انھوں نے قرآن کا بھی مذاق اڑایا تو آخرت میں سب سے زیادہ خسارے میں تو یہ لوگ ہوں گے ہی!

وَاِنَّكَ لَتُلَقَّى الْقُرْاٰنَ مِنْ لَّدُنْ حَكِيْمٍ عَلِيْمٍ (۶)

آنحضرتؐ کو تسلی

یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے تسلی ہے کہ یہ لوگ اگر ایمان نہیں لاتے بلکہ تمھاری مخالفت کے درپے ہیں تو تم ان کی پروا نہ کرو بلکہ مطمئن رہو کہ یہ کلام تمھارے اوپر جس ذات کی طرف سے اتارا جا رہا ہے وہ حکیم بھی ہے اور علیم بھی۔ اس کے ہر کام میں حکمت ہوتی ہے اور وہ ہر چیز سے باخبر ہے تو جو کچھ اس کے علم و حکمت کا تقاضا ہوگا وہی ہوگا اور اسی میں تمھارے لیے خیر ہے۔ جب وہ حکیم و علیم تمھارے اوپر اس کلام کو نازل فرما رہا ہے تو وہ تمھیں تنہا نہیں چھوڑے گا بلکہ ہر قدم پر تمھاری رہنمائی فرمائے گا اور تمھیں منزلِ مقصود پر پہنچائے گا۔

## ۲- آگے کا مضمون ——— آیات ۷-۱۴

آگے حضرت موسیٰؑ کی سرگزشت کے اس حصہ کا اجمالی حوالہ ہے جب ان کو اللہ تعالیٰ نے نبوت سے سرفراز فرمایا ہے اور نو معجزات سے مسلح کر کے ان کو فرعون اور اس کی قوم کے پاس انذار کے لیے جانے کی ہدایت فرمائی۔ یہاں اس سرگزشت کے حوالہ سے مقصود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خاص طور پر تین باتوں کی طرف

متوجہ کرتا ہے۔

پہلی یہ کہ آپ کو بھی اللہ تعالیٰ نے اسی طرح قرآن کی وحی سے سرفراز فرمایا جس طرح حضرت موسیٰ کو نبوت سے سرفراز فرمایا۔ یہ اللہ تعالیٰ کا ایک انعام ہے جو آپ پر ہوا ہے۔ نہ آپ کو اس نئے تجربے سے پریشان ہونا چاہیے اور نہ دوسروں کو اس سے متوحش ہونے کی کوئی وجہ ہے۔

دوسری یہ کہ جو لوگ ایمان نہیں لانا چاہتے وہ دنیا جہان کے معجزے دیکھ کر بھی اندھے ہی بنے رہتے ہیں۔ حضرت موسیٰ کو اللہ تعالیٰ نے ایک دو نہیں بلکہ اکٹھے نو معجزات دیے اور جن لوگوں کو وہ معجزے دکھائے گئے ان کو یقین تھا کہ یہ خدائی معجزات ہیں لیکن پھر بھی وہ ایمان نہیں لائے۔

تیسری یہ کہ مفسدین کو اللہ تعالیٰ ایک خاص مدت تک ڈھیل دینے کے بعد لازماً فنا کر دیتا ہے۔

اس روشنی میں آگے کی آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۷-۱۴

إِذْ قَالَ مُوسَىٰ لِأَهْلِهِ إِنِّي آنَسْتُ نَارًا سَآتِيكُم مِّنْهَا بِخَبَرٍ أَوْ آتِيكُم بِشِهَابٍ قَبَسٍ لَّعَلَّكُمْ تَصْطَلُونَ ﴿٧﴾ فَلَمَّا جَاءَهَا نُودِيَ أَن بُورِكَ مَن فِي النَّارِ وَمَنْ حَوْلَهَا وَسُبْحَانَ اللَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ ﴿٨﴾ يَا مُوسَىٰ إِنَّهُ أَنَا اللَّهُ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ﴿٩﴾ وَأَلْقِ عَصَاكَ ۚ فَلَمَّا رَآهَا تَهْتَزُّ كَأَنَّهَا جَانٌّ وَلَّىٰ مُدْبِرًا وَلَمْ يُعَقِّبْ ۚ يَا مُوسَىٰ لَا تَخَفْ إِنِّي لَا يَخَافُ لَدَيَّ الْمُرْسَلُونَ ﴿١٠﴾ إِلَّا مَن ظَلَمَ ثُمَّ بَدَّلَ حُسْنًا بَعْدَ سُوءٍ فَإِنِّي غَفُورٌ رَّحِيمٌ ﴿١١﴾ وَأَدْخِلْ يَدَكَ فِي جَيْبِكَ تَخْرُجْ بَيْضَاءَ مِنْ غَيْرِ سُوءٍ ۖ فِي تِسْعِ آيَاتٍ إِلَىٰ فِرْعَوْنَ وَقَوْمِهِ ۚ إِنَّهُمْ كَانُوا قَوْمًا فَاسِقِينَ ﴿١٢﴾ فَلَمَّا جَاءَتْهُمْ آيَاتُنَا مُبْصِرَةً قَالُوا هَٰذَا سِحْرٌ مُّبِينٌ ﴿١٣﴾ وَجَحَدُوا بِهَا وَاسْتَيْقَنَتْهَا أَنفُسُهُمْ ظُلْمًا وَعُلُوًّا ۚ فَانظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُفْسِدِينَ ﴿١٤﴾

ع ۱

ترجمۂ آیات ۷-۱۴

یاد کرو جب موسیٰؑ نے اپنے گھر والوں سے کہا، میں نے ایک آگ سی دیکھی ہے۔ میں وہاں سے یا تو کوئی خبر لاتا ہوں یا آگ کا کوئی انگارا تاکہ تم تاپو۔ تو جب وہ اس کے پاس آیا تو اس کو آواز آئی کہ مبارک ہے وہ جو اس آگ میں ہے اور جو اس کے ارد گرد میں! اور پاک ہے اللہ، عالم کا خداوند! ۷-۸

اے موسیٰ، یہ تو میں ہوں، خدائے عزیز و حکیم! اور تم اپنا عصا ڈال دو۔ تو جب اس نے اس کو اس طرح حرکت کرتے دیکھا گویا سانپ ہو تو وہ پیچھے کو مڑا اور پلٹ کر بھی نہیں دیکھا۔ ارشاد ہوا کہ اے موسیٰ ڈرو نہیں، میرے حضور پیغمبروں کے لیے کوئی اندیشہ نہیں ہوتا۔ ہاں مگر جو کسی برائی کا مرتکب ہوا پھر اس نے برائی کے بعد اس کو بھلائی سے بدل دیا تو میں بخشنے والا اور مہربان ہوں۔ ۹-۱۱

اور تم اپنا ہاتھ اپنے گریبان میں ڈالو، وہ بغیر کسی مرض کے سفید نکلے گا۔ نو نشانیوں کے ساتھ فرعون اور اس کی قوم کے پاس جاؤ۔ وہ بڑے ہی نافرمان لوگ ہیں۔ پس جب ان کے پاس ہماری آنکھیں کھول دینے والی نشانیاں آئیں۔ انھوں نے کہا یہ تو کھلا ہوا جادو ہے۔ اور انھوں نے ظلم اور گھمنڈ کے سبب سے ان کا انکار کیا حالانکہ ان کے دلوں نے ان کو تسلیم کیا تو دیکھو کیا ہوا ان مفسدین کا انجام! ۱۲-۱۴

## ۳- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

إِذْ قَالَ مُوسَىٰ لِأَهْلِهِ إِنِّي آنَسْتُ نَارًا سَآتِيكُم مِّنْهَا بِخَبَرٍ أَوْ آتِيكُم بِشِهَابٍ قَبَسٍ لَّعَلَّكُمْ تَصْطَلُونَ (۷)

حضرت موسیٰؑ کی سرگزشت حضورؐ کے لیے سبق آموز

حضرت موسیٰؑ کی یہ سرگزشت پچھلی سورتوں میں گزر چکی ہے اور اس کے ہر جزو کی وضاحت بھی ہو چکی ہے۔ یہاں ہم اس کے صرف اس پہلو کو مدِ نظر رکھیں گے جس کا تعلق سورہ کے نظام سے ہے۔ نبوت و رسالت کے

متعلق یہ بات معلوم ہے کہ یہ کوئی عام تجربے کی چیز نہیں ہے۔ اس کا تجربہ صرف انہی لوگوں کو ہوا ہے جن کو اللہ تعالیٰ نے اس کارِ خاص کے لیے منتخب فرمایا ہے۔ اس وجہ سے جن کو یہ چیز عطا ہوئی ان کو بھی اس کے اسرار و رموز سے مانوس ہونے میں کچھ وقت لگا اور جن کے سامنے اس کی دعوت پیش کی گئی انھوں نے بھی اس کو بالعموم ایک انوکھی اور عجیب چیز سمجھا اور اس کے خلاف طرح طرح کے شبہات و اعتراضات اٹھائے۔ ان دونوں ہی چیزوں کا واحد علاج یہی ہو سکتا تھا کہ ان نبیوں کے حالات سنائے جائیں جو اس سلسلہ کے تمام مراحل سے گزر چکے تھے تاکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی ان کے مشاہدات و تجربات سے طمانیت و سکینت حاصل ہو اور آپ کے معترضین و مخالفین پر بھی ان کی حجت قائم ہو سکے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اور آپ سے سب سے زیادہ مشابہ نبی و رسول سیدنا موسیٰؑ تھے جن کی زندگی کے حالات بھی تفصیل کے ساتھ تورات میں موجود تھے اور ان پر ایمان کی مدعی ایک قوم بھی موجود تھی جو بدقسمتی سے قرآن اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی، جیسا کہ آگے اس سورہ میں بھی اس کی طرف اشارہ آئے گا، مخالفت کر رہی تھی۔ اس وجہ سے حضرت موسیٰؑ کے حالات و تجربات اس مرحلے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے بھی سب سے زیادہ تسکین بخش ہو سکتے تھے اور مخالفین کے لیے بھی سب سے زیادہ سبق آموز ہو سکتے تھے بشرطیکہ وہ ان سے سبق حاصل کرنے کی کوشش کرتے۔ انہی دونوں مقصدوں سے یہ سرگزشت سنائی جا رہی ہے۔ مخاطب اگرچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہی ہیں لیکن روئے سخن مخالفین کی طرف بھی ہے۔

نبوت ایک موہبتِ ربانی ہے

اس آیت سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ نبوت و رسالت ایک خاص موہبتِ ربانی اور فضلِ یزدانی ہے۔ اس کو اکتساب یا طلب و تمنا سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ مصنف، شاعر، خطیب، کاہن، ساحر، منجم، جوتشی اور اس قبیل کے سارے ہی لوگ اپنے اپنے فن اور پیشہ کو سیکھنے کے لیے جدوجہد کرتے ہیں اور اس کی طلب و تمنا میں ایک عمر کھپاتے ہیں تب کہیں ان کو اپنے فن میں کچھ درخور حاصل ہوتا ہے لیکن نبی و رسول کی تربیت اللہ تعالیٰ خود اپنی نگرانی میں کرتا ہے۔ نبی نہ کسی کا شاگرد ہوتا، نہ وہ کسی مدرسہ میں بیٹھتا اور نہ اس کے ذہن میں نبوت کا کوئی گمان یا ارمان ہوتا بس اللہ تعالیٰ ہی، زندگی کے نشیب و فراز کے امتحانوں سے گزار کر، اس کو اس کارِ خاص کے لیے تیار کرتا ہے جو اس کے سپرد کیا جاتا ہے۔ حضرت یوسفؑ کی تربیت مصر کے زندان میں ہوئی۔ حضرت داؤدؑ نے اپنی نسبت خود فرمایا ہے کہ "مجھے خداوند نے بھیڑ سالہ سے نکالا اور اسرائیل کے تخت پر لا بٹھایا" اسی طرح حضرت موسیٰؑ، جن کی سرگزشت یہاں بیان ہو رہی ہے، مدین میں حضرت شعیبؑ کی بکریاں چراتے رہے۔ وہاں سے مصر کے لیے واپس ہوتے ہوئے اندھیری اور ٹھنڈی رات میں راستہ بھول گئے۔ دور سے ایک روشنی دکھائی دی۔ انھوں نے گھر والوں سے کہا تم لوگ یہیں ٹھہرو۔ مجھے آگ نظر آئی ہے۔ میں وہاں جاتا ہوں، اگر کچھ لوگ وہاں ہوئے تو ان سے راستہ کا پتہ کرتا ہوں ورنہ آگ ہی کا کوئی انگارہ لاتا ہوں کہ تم لوگ اس سردی میں تاپ سکو۔

فَلَمَّا جَآءَهَا نُوْدِیَ اَنْۢ بُوْرِكَ مَنْ فِی النَّارِ وَمَنْ حَوْلَهَا ؕ وَسُبْحٰنَ اللّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ (۸)

رب العالمین کی ندا حضرت موسیٰؑ کو

حضرت موسیٰؑ تو آگ لینے گئے لیکن وہاں یہ آواز سنائی دی کہ مبارک ہے وہ جو اس آگ میں ہے اور وہ جو اس کے ارد گرد ہیں۔ مجہول کا صیغہ ابہام اور تفخیم کو ظاہر کر رہا ہے یعنی حضرت موسیٰؑ کو ایک ہاتف کی آواز تو سنائی دی لیکن وہ یہ متعین نہ کر سکے کہ یہ کس کی آواز ہے اور کہاں سے آئی ہے۔ اَنْۢ بُوْرِكَ مَنْ فِی النَّارِ وَمَنْ حَوْلَهَا یہ اسی آواز کی تفصیل ہے کہ یہ آگ نہیں ہے بلکہ اس روشنی کے پردے میں اللہ تعالیٰ کی بابرکت ذات اپنے بابرکت کروبیوں کے جلو میں جلوہ گر ہوئی ہے۔ اپنی اور اپنے کروبیوں دونوں کی مبارکی کا حوالہ اس موقع پر صرف بیانِ حقیقت کے لیے نہیں بلکہ حضرت موسیٰؑ کو مانوس کرنے کے لیے بھی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ مرحلہ حضرت موسیٰؑ کے لیے نہایت اہم تھا۔ دامنِ کوہ اور اندھیری رات میں، بالکل خلافِ توقع، اس آواز کو سن کر حضرت موسیٰؑ پر نہیں معلوم کیا گزری ہوگی اور نہ معلوم کیا گزرتی اگر اس کا پہلا ہی کلمہ برکت کی بشارت کا نہ ہوتا۔ اس مبارک کلمہ نے حضرت موسیٰؑ کی بڑی ڈھارس بندھائی ہوگی کہ جو آواز ان کو سنائی دی ہے اس کے پیچھے کوئی خطرہ نہیں ہے بلکہ یہ منبعِ خیر و برکت سے ایک بابرکت آواز آئی ہے۔

وَسُبْحٰنَ اللّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ تنزیہہ کا کلمہ ہے اور یہ اسی مضمون کی تاکید مزید ہے جو اوپر والے ٹکڑے میں بیان ہوا ہے۔ یعنی اللہ، عالم کا رب، ہر عیب سے پاک اور منزّہ ہے اور یہ اسی کی تجلّی ہے جو تمھیں نظر آئی ہے تو اس پر بھروسہ رکھو۔ وہ تمھارے ساتھ وہی کرے گا جو اس کی رحمت و ربوبیت کے شایانِ شان ہے۔ اس سے کسی گزند کا اندیشہ نہیں ہے۔ اور وہ تمام عالم کا رب ہے اس وجہ سے اس کے اختیار میں سب کچھ ہے۔

یٰمُوْسٰۤی اِنَّهٗۤ اَنَا اللّٰهُ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ (۹)

صفاتِ عزیز و حکیم کا تعارف

اوپر کی بات تو ہاتفِ غیب کی آواز تھی جو حضرت موسیٰؑ کو سنائی دی۔ اب یہ خود حضرت موسیٰؑ کو خطاب کر کے رب العزت نے اپنا تعارف کرایا کہ میں ہی خدائے عزیز و حکیم ہوں۔ ان صفات سے تعارف کرانے کی وجہ ظاہر ہے کہ یہ نہیں ہو سکتا کہ حضرت موسیٰؑ ان سے ناواقف تھے۔ حضرت موسیٰؑ بنی اسرائیل میں پیدا ہوئے تھے اور ایک مدت تک حضرت شعیبؑ کی صحبت و معیت میں رہے تھے اس وجہ سے اللہ تعالیٰ کی ان صفات سے ناواقف نہیں ہو سکتے تھے۔ مقصود ان کی تذکیر سے اس مہم کے لیے ان کے قلب کو مضبوط کرنا تھا جس پر اللہ تعالیٰ نے ان کو مامور فرمانا چاہا۔ پچھلی سورہ میں اَلْعَزِیْزُ الرَّحِیْمُ کی صفات بار بار آئی ہیں اور ان کے مضمرات ہم واضح کر چکے ہیں۔ یہاں عَزِیْزٌ کے ساتھ حَكِیْمٌ کی صفت آئی ہے۔ جس سے مقصود اس حقیقت کو واضح کرنا ہے کہ جس ذات نے تم کو اس وقت خطاب و کلام سے مشرف فرمایا ہے۔ وہ ہر چیز پر غالب و مقتدر ہے۔ کوئی اس کے کسی ارادے میں مزاحم نہیں ہو سکتا اور ساتھ

ہی وہ حکیم ہے اس کا ہر ارادہ حکمت و مصلحت پر مبنی ہے اور اسلوب کلام چونکہ حصر در حصر کا ہے۔ اس وجہ سے اس سے یہ بات بھی نکلتی ہے کہ میرے مقابل میں کسی اور کے زور و اقتدار یا میری حکمت و مصلحت کے مقابل میں کسی اور کی حکمت و مصلحت کے تصور کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ غور کیجیے کہ ان صفات کی معرفت اس مہم کی ذمہ داریوں کو اٹھانے کے لیے کتنی ضروری تھی جس پر حضرت موسیٰؑ مامور کیے جا رہے تھے اور جس کا ذکر آگے کی آیات میں آ رہا ہے۔ خدا کی انہی صفات کی معرفت نے حضرت موسیٰؑ کے اندر وہ عزیمت پیدا کی کہ وہ بنی اسرائیل جیسی نکمی قوم کے ساتھ فرعون جیسے جبار کے مقابلہ کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے اور اللہ تعالیٰ نے ان کو ہر قدم پر فیروز مندی عطا فرمائی۔

وَاَلْقِ عَصَاكَ ۚ فَلَمَّا رَاٰهَا تَهْتَزُّ كَاَنَّهَا جَآنٌّ وَّلّٰى مُدْبِرًا وَّلَمْ يُعَقِّبْ ۚ يٰمُوْسٰى لَا تَخَفْ ۣ اِنِّىْ لَا يَخَافُ لَدَىَّ الْمُرْسَلُوْنَ (۱۰)

انبیاء کے معاملہ میں ایک خاص قابلِ توجہ پہلو

اوپر کی آیات میں حضرت موسیٰؑ کو پیش نظر مہم کے لیے ذہنی و قلبی طور پر تیار کرنے والی تعلیمات ہیں۔ اس کے بعد ان کو وہ عظیم ظاہری نشانیاں دی گئیں جن سے فرعون کے مقابلہ کے لیے ان کا مسلح ہونا ضروری تھا۔ ان میں سب سے اہم نشانی عصا کی تھی جس سے بعد کی تمام نشانیوں کا ظہور ہوا۔ اس نشانی کی وضاحت دوسرے مقامات میں ہو چکی ہے اور یہ بات بھی ہم واضح کر چکے ہیں کہ بالکل پہلے ہی مرحلے میں حضرت موسیٰؑ کو یہ نشانیاں کیوں دی گئیں۔ یہاں صرف ایک بات خاص طور پر قابل توجہ ہے کہ جب حضرت موسیٰؑ نے

نبوت کے ابتدائی مشاہدات نبی کے لیے نامانوس ہوتے ہیں

اللہ تعالیٰ کی ہدایت کے مطابق، عصا کو زمین پر ڈال دیا اور وہ سانپ کے مانند رینگنے لگا تو حضرت موسیٰؑ ایسا ڈر کے بھاگے کہ پیچھے مڑ کر بھی نہ دیکھا۔ اس واقعہ کا یہ پہلو ہمارے نزدیک اس حقیقت کے اظہار کے لیے یہاں خاص طور پر ظاہر کیا گیا ہے کہ نبوت کے ابتدائی مرحلہ کے مشاہدات نبی کے لیے بالکل نامانوس، نہایت انوکھے اور عجیب ہوتے ہیں اس وجہ سے وہ شروع شروع میں ان سے گھبراتا ہے لیکن پھر آہستہ آہستہ اللہ تعالیٰ اس کو ان سے مانوس کر دیتا ہے۔ یہ اس بات کی شہادت ہے کہ حضرات انبیاء علیہم کو یہ چیز طلب اور ارمان پر نہیں ملی ہے بلکہ بالکل خلافِ توقع اس کا ظہور ہوا ہے اور بڑے اندیشوں، بڑی فکروں اور بہت ہی احتیاط کے ساتھ انھوں نے ایک خلیفۂ الٰہی کی حیثیت سے اس کی ذمہ داری اٹھائی ہے جب کہ ان کو پوری طرح یہ شرح صدر حاصل ہو گیا ہے کہ جو مشاہدے ان کو ہو رہے ہیں یہ خدا کی طرف سے ہیں اور وہ ایک خاص فریضہ کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے مامور ہیں۔ ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ابتدائے نبوت میں جو مشاہدے ہوئے اور ان کے سبب سے آپؐ پر شروع شروع میں جو کیفیت طاری رہی اس کے بعض اہم پہلوؤں کی طرف آخری گروپ کی سورتوں میں اشارات ہیں۔ ان شاء اللہ ان کے محل میں ہم ان کی وضاحت کریں گے۔

حضرت موسیٰؑ کی تسکین

'يٰمُوْسٰى لَا تَخَفْ ۣ اِنِّىْ لَا يَخَافُ لَدَىَّ الْمُرْسَلُوْنَ'۔ جب حضرت موسیٰؑ اپنے عصا کو سانپ

کی صورت میں دیکھ کر بھاگے اور پیچھے مڑ کے بھی دیکھنے کی انھیں جرأت نہ ہوئی تو اللہ تعالیٰ نے ان کو نہایت دل نوازانہ انداز میں تسلی دی کہ موسیٰؑ! تم نہ ڈرو، اس سے تم کو کوئی خطرہ نہیں ہے۔ اس سے جو خطرہ پیش آئے گا وہ تمھارے دشمنوں کو پیش آئے گا۔ اللہ تعالیٰ کے حضور میں اس کے رسولوں کے لیے کوئی اندیشہ نہیں ہوتا۔ وہ بالکل مامون و محفوظ ہوتے ہیں۔ البتہ جن لوگوں کی طرف وہ بھیجے جاتے ہیں ان لوگوں کے لیے خطرہ ہے اگر وہ رسولوں پر ایمان نہیں لاتے۔ مطلب یہ ہے کہ تم خدا کے رسول ہو اور یہ عصا تمھارے لیے ایک تلوار ہے تو تم اس سے کیوں ڈرو، اس سے ڈریں تمھارے دشمن!

حضرت موسیٰؑ کے لیے پہلی نشانی

إِلَّا مَنْ ظَلَمَ ثُمَّ بَدَّلَ حُسْنًا بَعْدَ سُوءٍ فَإِنِّي غَفُورٌ رَّحِيمٌ (۱۱)

اللہ تعالیٰ کے نیک اور سلیم الفطرت بندوں کا حال یہ ہوتا ہے کہ جب ان کو کوئی اندیشے کی حالت پیش آتی ہے تو فوراً ان کا ذہن اپنی کسی غلطی کی طرف جاتا ہے کہ مبادا یہ اسی کا خمیازہ ہو۔ ہو سکتا ہے کہ حضرت موسیٰؑ کا ذہن اس موقع پر قبطی کے قتل کے واقعہ کی طرف منتقل ہوا ہو۔ اگرچہ اس کے بعد حضرت موسیٰؑ نے توبہ کر لی تھی اور اللہ تعالیٰ نے ان کی توبہ قبول بھی فرمالی تھی لیکن حضرات انبیاء اور صالحین اپنا محاسبہ کرنے میں بڑے محتاط ہوتے ہیں۔ اس وجہ سے لَا يَخَافُ لَدَيَّ الْمُرْسَلُونَ کے وعدہ بشارت کو موکد کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰؑ کو یہ اطمینان بھی دلا دیا کہ میرے کسی بندے سے اگر کوئی غلطی صادر ہو جاتی ہے، پھر وہ توبہ و اصلاح سے اس کی تلافی کر دیتا ہے تو میں اس کو معاف کر دیتا ہوں، میں بڑا ہی غفور و رحیم ہوں۔ اس بات کو یہاں عام صیغے میں فرما کر اس کے فیض کو ہمہ گیر کر دیا ہے کہ یہ معاملہ کچھ تمھارے ہی لیے خاص نہیں ہے بلکہ میں اپنے ہر بندے کے ساتھ یہی معاملہ کرتا ہوں۔

حضرت موسیٰؑ کے ایک اندیشہ کا ازالہ

وَأَدْخِلْ يَدَكَ فِي جَيْبِكَ تَخْرُجْ بَيْضَاءَ مِنْ غَيْرِ سُوءٍ فِي تِسْعِ آيَاتٍ إِلَىٰ فِرْعَوْنَ وَقَوْمِهِ إِنَّهُمْ كَانُوا قَوْمًا فَاسِقِينَ (۱۲)

یہ دوسری نشانی ہے جو اسی موقع پر عطا ہوئی۔ اس کی وضاحت بھی پیچھے سورۂ اعراف اور سورۂ طٰہٰ وغیرہ میں ہو چکی ہے۔ تَخْرُجْ بَيْضَاءَ کے ساتھ مِنْ غَيْرِ سُوءٍ کی قید حضرت موسیٰؑ کے اس تردد کے رفع کرنے کے لیے تھی کہ ہاتھ کے سفید ہونے سے ان کو کسی مرض کا وہم نہ ہو۔ قرآن کے اسلوب بیان سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ یہ اطمینان دہانی ان کو یہ معجزہ دیتے وقت ہی کر دی گئی تھی اور یہی بات قرین عقل و فطرت ہے۔ حضرت موسیٰؑ کو عصا کے معجزے سے جو تشویش ہوئی تھی اسی طرح کی تشویش ان کو اس معجزے سے بھی ہوتی اگر یہ اطمینان دہانی ان کو نہ کر دی جاتی۔ اس سے ضمناً تورات کے اس بیان کی تردید ہوتی ہے کہ حضرت موسیٰؑ کے ہاتھ میں برص کے مانند سفیدی آتی تھی۔ اس پر تفسیر سورۂ طٰہٰ میں ہم گفتگو کر چکے ہیں۔

حضرت موسیٰؑ کے لیے دوسری نشانی

فِي تِسْعِ آيَاتٍ إِلَىٰ فِرْعَوْنَ وَقَوْمِهِ، اس سے پہلے فعل اِذْهَبْ محذوف ہے۔ یعنی نو نشانیوں سے مسلح ہو کر فرعون اور اس کی قوم کے پاس انذار کے لیے جاؤ، وہ بڑے ہی نافرمان ہو گئے

[illegible]

ہیں۔ ابتداءً تو حضرت موسیٰؑ کو عصا اور ید بیضا کی دو ہی نشانیاں دی گئیں لیکن ان کے اندر بہت سی نشانیاں مضمر تھیں جو بعد کے مراحل میں ظاہر ہوئیں۔ ان نشانیوں کی تفصیل، تورات کے حوالوں کے ساتھ بقرہ، اعراف اور طٰہٰ وغیرہ کی تفسیر میں ہو چکی ہے۔ یہ تمام نشانیاں حضرت موسیٰؑ کے عصا سے ظاہر ہوئیں اس وجہ سے عصا کی صورت میں حضرت موسیٰؑ کو فرعون کے مقابلہ کے لیے گویا پوری میگزین دے دی گئی۔ یہ امر بھی یہاں واضح رہے کہ ان نو نشانیوں سے بھی صرف وہ نشانیاں مراد ہیں جو فرعون اور اس کی قوم کے مقابل میں ظاہر ہوئیں۔ وہ نشانیاں جو اس عصا کے ذریعہ سے خاص بنی اسرائیل کے لیے ظاہر ہوئیں وہ ان سے بالکل الگ ہیں اور ان کی تعداد بھی، تورات سے معلوم ہوتا ہے کہ کم نہیں ہے، بہت ہے۔

فَلَمَّا جَآءَتْهُمْ اٰيٰتُنَا مُبْصِرَةً قَالُوْا هٰذَا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ (۱۳)

حضرات انبیاء کے معجزات آنکھیں کھول دینے والے ہوتے ہیں

'مُبْصِرَةً' کے معنی ہیں آنکھیں کھول دینے والی نشانیاں۔ حضرات انبیاء علیہم السلام سے جو معجزات ظہور میں آئے ان کا معجزہ ہونا دیکھنے والوں سے مخفی نہیں رہا۔ ان کی قاہری نے اندھوں کی آنکھیں بھی کھول دیں لیکن جو لوگ نہیں ماننا چاہتے تھے انھوں نے حضرت موسیٰؑ کے ان معجزات کو بھی جادو قرار دے دیا۔ یہاں تک کہ خود جادوگروں نے بھی علی الاعلان اعتراف کر لیا کہ یہ جادو نہیں ہے لیکن پھر بھی ہٹ دھرموں نے اپنی ضد نہیں چھوڑی، اس کو جادو ہی کہتے رہے۔ یہاں وہ بات یاد رکھیے جو اوپر گزر چکی ہے کہ ایک ساحر کا انتہائی کمال یہ ہوتا ہے کہ اس کی لٹھیا سانپ کی طرح رینگنے لگ جائے اور اس کرتب کے لیے نہ جانے وہ کیا کیا پاپڑ بیلتا ہے تب کہیں جا کر اس کو اپنے فن میں کچھ دخل حاصل ہوتا ہے اور اس پر اس کو بڑا ناز ہوتا ہے۔ لیکن حضرت موسیٰؑ کا حال یہ ہوا کہ وہ اپنے عصا کو سانپ کی طرح رینگتے دیکھ کر ڈر کے بھاگے اور اس وقت تک ان کو قرار نہیں آیا جب تک اللہ تعالیٰ نے ان کو تسلی نہیں دی، پھر بھی ظالموں نے ان کو ایک ماہر جادوگر اور ان کی نشانی کو ایک 'سحر مبین' قرار دیا۔

وَجَحَدُوْا بِهَا وَاسْتَيْقَنَتْهَآ اَنْفُسُهُمْ ظُلْمًا وَّعُلُوًّا ۭ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُفْسِدِيْنَ (۱۴)

منکروں کے انکار کا اصل سبب ان کا 'ظلم' اور 'علو' ہوتا ہے

یہ آخر میں وہ اصل مدعا سامنے رکھ دیا گیا ہے جس کے لیے یہ سرگزشت سنائی گئی ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے فرمایا گیا ہے کہ جو لوگ دعوت حق کو قبول نہیں کرنا چاہتے وہ ایک دو نہیں بلکہ نو نو معجزات دیکھ کر بھی اپنے انکار کے لیے کوئی نہ کوئی بہانہ ڈھونڈ ہی لیتے ہیں۔ ان کے دل اقرار کرتے ہیں کہ داعی کی بات حق ہے لیکن زبانوں سے وہ برابر اس کی تکذیب ہی کرتے رہتے ہیں۔ ان کے انکار کی اصل علت یہ نہیں ہوتی کہ حق ان پر اچھی طرح واضح نہیں ہوتا بلکہ اس کا اصل سبب ان کا 'ظلم' اور 'علو' ہوتا ہے۔ وہ خدا اور اس کے بندوں کے حقوق تلف کرنے کے خوگر ہو جاتے ہیں اور کسی قیمت پر بھی اس سے دست بردار ہونا نہیں چاہتے اور ان کے اندر استکبار پیدا ہو جاتا ہے جس کے سبب سے اپنی خواہش کے خلاف کسی بڑے سے بڑے حق کے آگے بھی جھکنے

کے لیے وہ تیار نہیں ہوتے۔ ایسے مفسدین کا انجام وہی ہوتا ہے جو فرعون اور اس کی قوم کا ہوا۔

## ۴۔ آگے کا مضمون ___ آیات ۱۵-۴۴

اوپر کی آیات سے یہ حقیقت واضح ہوئی کہ حق کے انکار کا اصل سبب حقیقت کا خفا نہیں بلکہ لوگوں کا ظلم و استکبار ہے۔ جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ نعمت عطا فرماتا ہے وہ نعمت ان کے لیے فتنہ بن جاتی ہے اور وہ بجائے اس کے کہ خدا کے زیادہ سے زیادہ شکر گزار اور اس کے فرمانبردار بندے بنیں خدا سے اکڑنے والے اور اس کی زمین میں فساد برپا کرنے والے بن جاتے ہیں۔ اب ان کے مقابل میں اللہ کے صالح و مصلح بندوں کا ذکر ہو رہا ہے کہ ان پر اللہ کی نعمتیں جتنی ہی زیادہ ہوتی جاتی ہیں ان کی گردنیں ثمربار شاخ کی طرح خدا کے آگے اتنی ہی جھکتی جاتی ہیں۔ اس کردار کی عملی مثال کے طور پر حضرت داؤد اور حضرت سلیمان علیہما السلام کو پیش کیا گیا ہے۔ ان کو اللہ تعالیٰ نے جو عظمت و شوکت عطا فرمائی ان کے ہم عصر حکمرانوں میں کسی کو بھی وہ حاصل نہیں ہوئی اور جن اسباب و وسائل پر ان کو تصرف بخشا ان پر کسی کو کبھی تصرف حاصل نہ ہوا لیکن یہ سب کچھ پا کر وہ کسی ظلم یا استکبار میں مبتلا نہیں ہوئے بلکہ انھوں نے ہر نعمت کو اللہ تعالیٰ کا ایک امتحان جانا، اس کا پورا پورا حق ادا کرنے کی کوشش کی اور اس امتحان میں پورے اترے۔ اس روشنی میں آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۱۵-۴۴

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا دَاوٗدَ وَسُلَيْمٰنَ عِلْمًا ۚ وَقَالَا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ فَضَّلَنَا عَلٰى كَثِيْرٍ مِّنْ عِبَادِهِ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۵﴾ وَوَرِثَ سُلَيْمٰنُ دَاوٗدَ وَقَالَ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ عُلِّمْنَا مَنْطِقَ الطَّيْرِ وَاُوْتِيْنَا مِنْ كُلِّ شَيْءٍ ۭ اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْفَضْلُ الْمُبِيْنُ ﴿۱۶﴾ وَحُشِرَ لِسُلَيْمٰنَ جُنُوْدُهٗ مِنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ وَالطَّيْرِ فَهُمْ يُوْزَعُوْنَ ﴿۱۷﴾ حَتّٰٓى اِذَآ اَتَوْا عَلٰى وَادِ النَّمْلِ ۙ قَالَتْ نَمْلَةٌ يّٰٓاَيُّهَا النَّمْلُ ادْخُلُوْا مَسٰكِنَكُمْ ۚ لَا يَحْطِمَنَّكُمْ سُلَيْمٰنُ وَجُنُوْدُهٗ ۙ وَهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ﴿۱۸﴾ فَتَبَسَّمَ ضَاحِكًا مِّنْ قَوْلِهَا وَقَالَ رَبِّ اَوْزِعْنِيْٓ اَنْ اَشْكُرَ نِعْمَتَكَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتَ عَلَيَّ وَ

عَلٰی وَالِدَیَّ وَاَنْ اَعْمَلَ صَالِحًا تَرْضٰىهُ وَاَدْخِلْنِیْ بِرَحْمَتِكَ
فِیْ عِبَادِكَ الصّٰلِحِیْنَ ﴿۱۹﴾ وَتَفَقَّدَ الطَّیْرَ فَقَالَ مَالِیَ لَاۤ اَرَی
الْهُدْهُدَ ۖ اَمْ كَانَ مِنَ الْغَآئِبِیْنَ ﴿۲۰﴾ لَاُعَذِّبَنَّهٗ عَذَابًا شَدِیْدًا
اَوْ لَاَاذْبَحَنَّهٗۤ اَوْ لَیَاْتِیَنِّیْ بِسُلْطٰنٍ مُّبِیْنٍ ﴿۲۱﴾ فَمَكَثَ غَیْرَ
بَعِیْدٍ فَقَالَ اَحَطْتُّ بِمَا لَمْ تُحِطْ بِهٖ وَجِئْتُكَ مِنْ سَبَاٍۭ
بِنَبَاٍ یَّقِیْنٍ ﴿۲۲﴾ اِنِّیْ وَجَدْتُّ امْرَاَةً تَمْلِكُهُمْ وَاُوْتِیَتْ مِنْ
كُلِّ شَیْءٍ وَّلَهَا عَرْشٌ عَظِیْمٌ ﴿۲۳﴾ وَجَدْتُّهَا وَقَوْمَهَا یَسْجُدُوْنَ
لِلشَّمْسِ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَزَیَّنَ لَهُمُ الشَّیْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ فَصَدَّهُمْ
عَنِ السَّبِیْلِ فَهُمْ لَا یَهْتَدُوْنَ ﴿۲۴﴾ اَلَّا یَسْجُدُوْا لِلّٰهِ الَّذِیْ
یُخْرِجُ الْخَبْءَ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَیَعْلَمُ مَا تُخْفُوْنَ
وَمَا تُعْلِنُوْنَ ﴿۲۵﴾ اَللّٰهُ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِیْمِ ﴿۲۶﴾ السجدة
قَالَ سَنَنْظُرُ اَصَدَقْتَ اَمْ كُنْتَ مِنَ الْكٰذِبِیْنَ ﴿۲۷﴾ اِذْهَبْ
بِّكِتٰبِیْ هٰذَا فَاَلْقِهْ اِلَیْهِمْ ثُمَّ تَوَلَّ عَنْهُمْ فَانْظُرْ مَاذَا
یَرْجِعُوْنَ ﴿۲۸﴾ قَالَتْ یٰۤاَیُّهَا الْمَلَؤُا اِنِّیْۤ اُلْقِیَ اِلَیَّ كِتٰبٌ كَرِیْمٌ ﴿۲۹﴾
اِنَّهٗ مِنْ سُلَیْمٰنَ وَاِنَّهٗ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ﴿۳۰﴾
اَلَّا تَعْلُوْا عَلَیَّ وَاْتُوْنِیْ مُسْلِمِیْنَ ﴿۳۱﴾ قَالَتْ یٰۤاَیُّهَا الْمَلَؤُا اَفْتُوْنِیْ ع ۲ ۱۷
فِیْۤ اَمْرِیْ ۚ مَا كُنْتُ قَاطِعَةً اَمْرًا حَتّٰی تَشْهَدُوْنِ ﴿۳۲﴾ قَالُوْا
نَحْنُ اُولُوْا قُوَّةٍ وَّاُولُوْا بَاْسٍ شَدِیْدٍ ۙ وَّالْاَمْرُ اِلَیْكِ فَانْظُرِیْ

مَاذَا تَأْمُرِيْنَ ﴿۳۳﴾ قَالَتْ اِنَّ الْمُلُوْكَ اِذَا دَخَلُوْا قَرْيَةً اَفْسَدُوْهَا
وَجَعَلُوْٓا اَعِزَّةَ اَهْلِهَآ اَذِلَّةً ۚ وَكَذٰلِكَ يَفْعَلُوْنَ ﴿۳۴﴾ وَاِنِّيْ مُرْسِلَةٌ
اِلَيْهِمْ بِهَدِيَّةٍ فَنٰظِرَةٌۢ بِمَ يَرْجِعُ الْمُرْسَلُوْنَ ﴿۳۵﴾ فَلَمَّا جَآءَ
سُلَيْمٰنَ قَالَ اَتُمِدُّوْنَنِ بِمَالٍ ۫ فَمَآ اٰتٰىنِۦَ اللّٰهُ خَيْرٌ مِّمَّآ اٰتٰىكُمْ ۚ
بَلْ اَنْتُمْ بِهَدِيَّتِكُمْ تَفْرَحُوْنَ ﴿۳۶﴾ اِرْجِعْ اِلَيْهِمْ فَلَنَاْتِيَنَّهُمْ بِجُنُوْدٍ
لَّا قِبَلَ لَهُمْ بِهَا وَلَنُخْرِجَنَّهُمْ مِّنْهَآ اَذِلَّةً وَّهُمْ صٰغِرُوْنَ ﴿۳۷﴾
قَالَ يٰٓاَيُّهَا الْمَلَؤُا اَيُّكُمْ يَاْتِيْنِيْ بِعَرْشِهَا قَبْلَ اَنْ يَّاْتُوْنِيْ
مُسْلِمِيْنَ ﴿۳۸﴾ قَالَ عِفْرِيْتٌ مِّنَ الْجِنِّ اَنَا اٰتِيْكَ بِهٖ قَبْلَ اَنْ
تَقُوْمَ مِنْ مَّقَامِكَ ۚ وَاِنِّيْ عَلَيْهِ لَقَوِيٌّ اَمِيْنٌ ﴿۳۹﴾ قَالَ الَّذِيْ
عِنْدَهٗ عِلْمٌ مِّنَ الْكِتٰبِ اَنَا اٰتِيْكَ بِهٖ قَبْلَ اَنْ يَّرْتَدَّ اِلَيْكَ
طَرْفُكَ ۭ فَلَمَّا رَاٰهُ مُسْتَقِرًّا عِنْدَهٗ قَالَ هٰذَا مِنْ فَضْلِ رَبِّيْ ڣ
لِيَبْلُوَنِيْٓ ءَاَشْكُرُ اَمْ اَكْفُرُ ۭ وَمَنْ شَكَرَ فَاِنَّمَا يَشْكُرُ لِنَفْسِهٖ ۚ
وَمَنْ كَفَرَ فَاِنَّ رَبِّيْ غَنِيٌّ كَرِيْمٌ ﴿۴۰﴾ قَالَ نَكِّرُوْا لَهَا عَرْشَهَا نَنْظُرْ
اَتَهْتَدِيْٓ اَمْ تَكُوْنُ مِنَ الَّذِيْنَ لَا يَهْتَدُوْنَ ﴿۴۱﴾ فَلَمَّا جَآءَتْ
قِيْلَ اَهٰكَذَا عَرْشُكِ ۭ قَالَتْ كَاَنَّهٗ هُوَ ۚ وَاُوْتِيْنَا الْعِلْمَ
مِنْ قَبْلِهَا وَكُنَّا مُسْلِمِيْنَ ﴿۴۲﴾ وَصَدَّهَا مَا كَانَتْ تَّعْبُدُ مِنْ
دُوْنِ اللّٰهِ ۭ اِنَّهَا كَانَتْ مِنْ قَوْمٍ كٰفِرِيْنَ ﴿۴۳﴾ قِيْلَ لَهَا ادْخُلِي
الصَّرْحَ ۚ فَلَمَّا رَاَتْهُ حَسِبَتْهُ لُجَّةً وَّكَشَفَتْ عَنْ سَاقَيْهَا ۭ

قَالَ إِنَّهُ صَرْحٌ مُّمَرَّدٌ مِّن قَوَارِيرَ ۗ قَالَتْ رَبِّ إِنِّي ظَلَمْتُ نَفْسِي وَأَسْلَمْتُ مَعَ سُلَيْمَانَ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ ﴿٤٤﴾

ع ۱۸ ۱۴

ترجمۂ آیات ۱۵-۴۴

اور ہم نے داؤدؑ اور سلیمانؑ کو بڑا علم عطا فرمایا اور انھوں نے کہا کہ شکر ہے اللہ کے لیے جس نے اپنے بہت سے مومن بندوں پر ہمیں فضیلت عطا فرمائی۔ ۱۵

اور داؤد کا وارث سلیمان ہوا۔ اور اس نے کہا، اے لوگو، ہمیں پرندوں کی بولی کا علم بھی عطا ہوا ہے اور دوسری بھی سب چیزیں ہمیں بخشی گئی ہیں۔ بے شک یہ نہایت ہی کھلا ہوا فضل ہے۔ ۱۶

اور سلیمان کے جائزے کے لیے اس کا سارا لشکر۔ جنوں، انسانوں اور پرندوں میں سے۔ اکٹھا کیا گیا اور ان کی درجہ بندی کی جا رہی تھی۔ یہاں تک کہ جب وہ چیونٹیوں کی وادی میں پہنچے، ایک چیونٹی نے کہا، اے چیونٹیو، اپنے سوراخوں میں گھس جاؤ کہ سلیمان اور ان کا لشکر تمھیں پامال نہ کر ڈالے اور انھیں اس کا احساس بھی نہ ہو۔ پس وہ اس کی بات سے خوش ہو کر مسکرایا اور دعا کی، اے میرے رب مجھے سنبھالے رکھ کہ میں اس فضل کا شکر گزار رہوں جو تو نے مجھ پر اور میرے ماں باپ پر فرمایا اور میں ایسے نیک کام کروں جو تجھے پسند ہوں اور تو اپنے فضل سے مجھے اپنے صالح بندوں کے زمرے میں داخل کر۔ ۱۷-۱۹

اور اس نے پرندوں کی فوج کا جائزہ لیا تو بولا کہ کیا بات ہے، میں ہُدہُد کو نہیں دیکھ رہا ہوں! وہ موجود ہے یا غیر حاضروں میں ہے! میں اس کو سخت سزا دوں گا یا ذبح کر ڈالوں گا یا پھر وہ کوئی واضح عذر میرے سامنے پیش کرے۔ زیادہ دیر نہیں گزری کہ وہ آیا

اور اس نے کہا کہ میرے علم میں وہ چیز ہے جو آپ کے علم میں نہیں ہے اور میں ملک سبا سے ایک سچی خبر لایا ہوں۔ میں نے دیکھا کہ ایک عورت اس پر حکمرانی کر رہی ہے اور اس کو سب کچھ حاصل ہے اور اس کا تخت بہت بڑا ہے۔ میں نے اس کو اور اس کی قوم کو دیکھا کہ وہ اللہ کے سوا سورج کو پوجتے ہیں اور شیطان نے ان کے اعمال ان کی نگاہوں میں کھبا دیے ہیں، پس ان کو صحیح راہ سے روک دیا ہے، پس وہ راہ یاب نہیں ہو رہے ہیں۔ ۲۰-۲۴

(شیطان نے ان کو صحیح راہ سے روک دیا ہے) کہ وہ اللہ کو سجدہ نہ کریں جو آسمانوں اور زمین کی پوشیدہ چیزوں کو ظاہر کرتا ہے اور وہ جانتا ہے جو کچھ تم چھپاتے ہو اور جو کچھ تم ظاہر کرتے ہو۔ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، وہی عرشِ عظیم کا مالک ہے۔ ۲۵-۲۶

اس نے کہا، ہم دیکھیں گے کہ تم نے سچ کہا ہے یا تم جھوٹوں میں سے ہو۔ یہ میرا نامہ لے کر جاؤ اور ان کے پاس ڈال دیجیو اور ہٹ کر دیکھیو کہ کیا ردِعمل وہ ظاہر کرتے ہیں۔ ۲۷-۲۸

اس نے کہا، اے اہلِ دربار، ایک گرامی نامہ میرے پاس ڈالا گیا ہے۔ وہ سلیمان کی طرف سے ہے اور وہ یہ ہے کہ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم، تم لوگ میرے مقابل میں سرکشی نہ کرو اور میرے پاس مطیع ہو کر حاضر ہو۔ اس نے کہا، اے درباریو، میرے اس معاملے میں مجھے رائے دو۔ میں کسی معاملے کا اس وقت تک فیصلہ نہیں کرتی جب تک آپ لوگ موجود نہ ہوں۔ ۲۹-۳۲

انھوں نے جواب دیا کہ ہم طاقت اور اعلیٰ جنگی صلاحیت رکھنے والے لوگ ہیں، فیصلہ آپ کے اختیار میں ہے تو غور فرما لیجیے کہ کیا حکم دیتی ہیں۔ ۳۳

اس نے کہا، بادشاہ لوگ جب کسی بستی میں داخل ہوتے ہیں تو اس کو درہم برہم اور اس کے معززین کو ذلیل کر کے چھوڑتے ہیں اور یہی یہ لوگ بھی کریں گے اور میں ان کے پاس

اپنے سفیر ہدیہ کے ساتھ بھیجتی ہوں اور دیکھتی ہوں کہ سفیر کیا جواب لاتے ہیں۔ ۴۴-۳۵

تو جب سفیر سلیمان کے پاس پہنچا، اس نے کہا کیا تم لوگ میری مدد مال سے کرنا چاہتے ہو۔ مجھے خدا نے جو دے رکھا ہے وہ اس سے کہیں بہتر ہے جو اس نے تم کو دیا ہے۔ یہ تمہی لوگ ہو کہ اپنے ہدیوں پر خوش ہوتے ہو۔ ان کے پاس واپس جاؤ، ہم ان پر ایسی فوجوں سے چڑھائی کریں گے کہ وہ ان کے مقابلے کی تاب نہ لا سکیں گے اور ہم ان کو وہاں سے ذلیل کر کے نکال دیں گے اور وہ خوار ہوں گے۔ ۳۶-۳۷

سلیمان نے کہا، اے درباریو! تم میں سے کون اس کا تخت ان لوگوں کے میرے حضور میں فرمانبردار ہو کر حاضر ہونے سے پہلے لائے گا، جنوں میں سے ایک سرہنگ نے کہا، میں اس کو آپ کے پاس آپ کے اس مجلس سے اٹھنے سے پہلے پہلے حاضر کردوں گا اور میں اس کام پر قدرت رکھنے والا اور ایک امانت دار ہوں۔ جس کے پاس کتاب کا علم تھا اس نے کہا، میں اس کو آپ کی پلک جھپکنے سے پہلے حاضر کر دوں گا۔ پس اس نے اس کو اپنے سامنے موجود دیکھا تو اس نے کہا یہ میرے رب کا فضل ہے تاکہ وہ میرا امتحان کرے کہ میں شکر کرتا ہوں یا ناشکری کرتا ہوں۔ اور جو شکر کرتا ہے تو اپنے ہی نفع کے لیے شکر کرتا ہے اور جس نے ناشکری کی تو میرا رب بے نیاز و کریم ہے۔ ۳۸-۴۰

اس نے حکم دیا کہ اس کے تخت کی شکل بدل دو، دیکھیں وہ پہچانتی ہے یا نہ پہچاننے والوں میں سے ہو کے رہ جاتی ہے۔ پس جب وہ آئی تو اس سے سوال کیا گیا کہ کیا تمہارا تخت ایسا ہی ہے؟ اس نے کہا، گویا کہ وہی ہے اور ہم کو اس سے پہلے علم حاصل ہو چکا تھا اور ہم فرمانبرداروں میں تھے۔ اور اس کو روک رکھا تھا ان چیزوں نے جن کو اللہ

کے ماسوا وہ پوجتی رہی تھی۔ وہ ایک کافر قوم میں سے تھی۔ ۴۱-۴۳

اس سے کہا گیا کہ محل میں داخل ہو جاؤ تو جب اس نے اس (کے فرش) کو دیکھا اس کو گہرا پانی گمان کیا اور اپنی دونوں پنڈلیاں کھول دیں۔ سلیمان نے کہا یہ تو شیشوں سے بنا ہوا محل ہے! اس نے کہا، اے میرے رب! میں نے اپنی جان پر ظلم ڈھایا، اور اب میں نے سلیمان کے ساتھ اپنے آپ کو اللہ رب العلمین کے حوالہ کیا۔ ۴۴

---

## ۵۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا دَاوٗدَ وَسُلَيْمٰنَ عِلْمًا ۚ وَقَالَا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ فَضَّلَنَا عَلٰى كَثِيْرٍ مِّنْ عِبَادِهِ الْمُؤْمِنِيْنَ (۱۵)

'علم' سے مراد

'عِلْمًا' سے مراد وہ حکمت و معرفت بھی ہے جو حضرت داؤد اور سلیمان علیہما السلام کو حاصل ہوئی جس کا مظہر زبور اور امثال ہیں اور سائنس کا وہ علم بھی ہے جس کی بدولت انھوں نے وہ عظیم سلطنت قائم کی جو اپنی بری و بحری قوت کے اعتبار سے اپنے زمانے کی سب سے زیادہ طاقت ور سلطنت تھی۔ سورۂ انبیاء کی تفسیر میں اس کی تفصیلات گزر چکی ہیں۔

حضرت داؤدؑ اور حضرت سلیمانؑ کا جذبۂ شکر

'وَقَالَا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ الآیۃ' یہ ان کے شکر و سپاس کی تعبیر ہے کہ اپنے زمانے کی سب سے زیادہ طاقت ور حکومت کے فرماں روا اور ایجادات و صنائع میں سب سے زیادہ ترقی یافتہ ہونے کے باوجود ان کے اندر ایک لمحہ کے لیے بھی یہ گھمنڈ نہیں پیدا ہوا کہ یہ سب کچھ ان کے اپنے ذاتی کارنامے ہیں بلکہ وہ برابر اپنے رب کے شکر گزار رہے کہ یہ عزت و فضیلت ان کو اللہ نے عطا فرمائی ہے۔ 'عَلٰى كَثِيْرٍ مِّنْ عِبَادِهِ الْمُؤْمِنِيْنَ' کے اندر یہ حقیقت مضمر ہے کہ اصل عزت و فضیلت ایمان کی عزت و فضیلت ہے۔ جس کو یہ حاصل نہیں ہے اس کے لیے عزت و فضیلت کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ البتہ یہ عزت و فضیلت کی بات ہے کہ کسی کو اللہ تعالیٰ اپنے باایمان بندوں میں سرفرازی بخشے۔

وَوَرِثَ سُلَيْمٰنُ دَاوٗدَ وَقَالَ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ عُلِّمْنَا مَنْطِقَ الطَّيْرِ وَاُوْتِيْنَا مِنْ كُلِّ شَيْءٍ ۭ اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْفَضْلُ الْمُبِيْنُ (۱۶)

حضرت سلیمانؑ کی فضائی فوج

یعنی حضرت داؤدؑ کے بعد حضرت سلیمانؑ ان کے وارث ہوئے۔ جیسا نامور باپ تھا اس سے بڑھ

کرنا موربٹیا ہوا۔ سورۂ انبیاء میں ہم واضح کر چکے ہیں کہ حضرت سلیمانؑ نے اپنی بری فوج کے ساتھ ساتھ اپنی بحری طاقت کو بڑی ترقی دی۔ ان کا بحری بیڑا دنیا کا سب سے زیادہ طاقتور بیڑا تھا۔ اس آیت سے اور آگے کی آیات سے واضح ہوتا ہے کہ ان کو پرندوں کی بولی کا بھی خاص علم عطا ہوا تھا اور ان کی تربیت کر کے وہ اپنی فوج میں ان سے نامہ بری، خبر رسانی اور سراغ رسانی کا کام نہایت اعلیٰ پیمانہ پر لیتے تھے اور اس طرح انھوں نے گویا اپنی ایک فضائی فوج بھی مرتب کر لی تھی لیکن یہ سب کچھ حاصل ہونے کے باوجود انھوں نے تنگ ظرفوں کی طرح یہ دعویٰ نہیں کیا کہ میں اب ایک ناقابلِ تسخیر طاقت بن گیا ہوں بلکہ آیت کا سیاق صاف اس بات کی دلیل ہے کہ جب ان کی فوجی قوت میں یہ شاندار اضافہ ہوا ہے تو بجائے اس پر فخر کرنے کے انھوں نے اپنی قوم کو یہ پیغام دیا کہ لوگو، ہمیں پرندوں کی بولی کا علم بھی حاصل ہو گیا ہے اور دوسرے اسباب و وسائل بھی، جو ترقی کے لیے ضروری ہیں، ہمیں حاصل ہیں تو یہ ہمارے اوپر خدا کا کھلا ہوا فضل ہے۔ مطلب یہ ہے کہ خدا کے اس کھلے ہوئے فضل کا حق یہ ہے کہ ہم اس کے زیادہ سے زیادہ شکر گزار اور اس کے سب سے بڑھ کر اطاعت گزار بنیں۔ تورات میں اگرچہ حضرت سلیمانؑ کو ایک بالکل دنیادار بادشاہ کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے بلکہ ان کی طرف نعوذ باللہ شرک و بت پرستی کی نسبت بھی کی گئی ہے لیکن کتاب سلاطین میں یہ تصریح موجود ہے کہ انھوں نے اپنی عظمت و شوکت کو برابر اللہ تعالیٰ کا فضل قرار دیا اور اپنی قوم کو بھی اس فضل و نعمت پر خدا ہی کا شکر گزار رہنے کی تاکید فرمائی۔

**'منطق الطیر' کا علم**

'عُلِّمۡنَا مَنۡطِقَ الطَّیۡرِ' سے یہ بات صاف معلوم ہوتی ہے کہ پرندوں کے اندر بھی نطق و ادراک ہے اور حضرت سلیمانؑ کو ان کے نطق کا خاص علم عطا ہوا تھا۔ اگر ہم ان کے نطق کو نہیں سمجھتے تو ہمارا نہ سمجھنا اس کی نفی کی کوئی دلیل نہیں ہے۔ قرآن میں صاف تصریح ہے کہ کائنات کی ہر چیز خدا کی تسبیح کرتی ہے لیکن ہم اس کی تسبیح نہیں سمجھتے۔ اسی طرح قرآن میں یہ بات بھی بیان ہوئی ہے کہ جتنے بھی چرند پرند ہیں سب ہماری ہی طرح الگ الگ امتیں ہیں۔ سورۂ نحل کی تفسیر میں ہم قرآن کے اس ارشاد کے مضمرات کی طرف اشارہ کر چکے ہیں۔ حضرت سلیمانؑ کو تو پرندوں کی بولی کا خاص علم عطا ہوا تھا جن کو یہ علم نہیں ملا ہے وہ بھی یہ جانتے ہیں کہ جتنے بھی حیوانات ہیں سب اپنی نفرت، محبت، عتاب، التفات، خوشی، غم، فکرمندی، طمانیت، استمالت، ملاعبت اور اپنے دوسرے جذبات کی تعبیر کے لیے الگ الگ بولیاں بھی اختیار کرتے ہیں اور ان کے اظہار کے لیے ان کی ادائیں اور حرکتیں بھی الگ الگ ہوتی ہیں۔ جو لوگ کسی مقصد خاص کے لیے ان جانوروں کی تربیت کرتے ہیں وہ ان کی آوازوں اور اشارات کو اسی طرح سمجھتے ہیں جس طرح اپنے ہم جنسوں کی بولی اور ان کے اشارات کو سمجھتے ہیں۔ پھر ان سے بھی زیادہ ان لوگوں کا علم ہے جنھوں نے سائنٹیفک طریقے

پران حیوانات کا تجربہ و مشاہدہ کیا ہے۔ انھوں نے اپنے علمی تجربہ و مشاہدے سے جو معلومات فراہم کی ہیں ان کو پڑھیے تو انسان دنگ رہ جاتا ہے کہ بڑے جانور تو درکنار ننھی سی چیونٹی کے اندر بھی قدرت نے جو دانش و بینش، جو زیرکی و ہوشیاری اور جو فہم و فراست ودیعت فرمائی ہے وہ ایسی ہے کہ اس سے انسان بہت کچھ سیکھ سکتا ہے۔ آج کتوں سے سراغ رسانی اور جاسوسی کے سلسلے میں جو کام لیے جا رہے ہیں کیا وہ کم حیرت انگیز ہیں! جب انسان اپنے تجربات اور اپنی تجرباتی سائنس کے ذریعے جانوروں کے اتنے اسرار دریافت کر سکتا ہے اور ان سے یہ کچھ کام لے سکتا ہے تو اللہ تعالیٰ نے اگر حضرت سلیمانؑ کو پرندوں کی بولی کا خاص علم دے دیا تو اس میں تعجب کی کیا بات ہے! یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ بولی درحقیقت آوازوں ہی کی ترکیب و تالیف سے وجود میں آتی ہے۔ جو چیزیں ادراک و شعور اور جذبات رکھتی ہیں وہ اپنے ادراک و شعور اور جذبات کی تعبیر کے لیے مختلف قسم کی آوازیں نکالتی ہیں اور انہی کی تالیف و ترکیب سے بولی وجود میں آتی ہے۔ اشارات بھی اسی میں داخل ہیں ان کو غیر ناطق زبان سمجھیے۔

وَحُشِرَ لِسُلَيْمٰنَ جُنُوْدُهٗ مِنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ وَالطَّيْرِ فَهُمْ يُوْزَعُوْنَ (۱۷)

'حُشِرَ لِسُلَيْمٰنَ' میں مضاف محذوف ہے۔ یعنی حضرت سلیمانؑ کے جائزہ اور ملاحظہ کے لیے ان کی ساری فوج جمع کی گئی۔

حضرت سلیمانؑ کی فوج

'وَزْعٌ' کے اصل معنی روکنے، تھامنے اور سنبھالنے کے ہیں۔ آگے آیت ۱۹ میں اسی معنی میں یہ لفظ استعمال ہوا ہے لیکن فوج کے تعلق سے جب یہ لفظ آئے تو اس کے معنی ترتیب دینے اور درجہ بندی و صف بندی کرنے کے ہوتے ہیں۔

اب یہ حضرت سلیمانؑ کی افواج کی ایک پریڈ کا ذکر فرمایا ہے جس میں ان کی تمام فوج، جو جنوں انسانوں اور پرندوں پر مشتمل تھی، ان کے ملاحظہ کے لیے اکٹھی کی گئی۔ 'فَهُمْ يُوْزَعُوْنَ' یعنی مقصود اس اجتماع سے ان کی ترتیب اور الگ الگ درجہ بندی تھی۔ یہاں اس پریڈ کے ذکر سے اصل مدعا، جیسا کہ آگے کی آیات سے واضح ہو گا، یہ دکھانا ہے کہ حضرت سلیمانؑ کی فوج کیسی حیرت انگیز صلاحیتیں رکھنے والے انسانوں، جنوں اور پرندوں پر مشتمل تھی۔ لیکن جب ان کے فوجیوں کی طرف سے ان کی حیرت انگیز صلاحیتیں ظاہر ہوئیں تو وہ بجائے اس کے کہ ان سے غرور اور گھمنڈ میں مبتلا ہوں اور یہ ڈھنڈورا پیٹیں کہ میں اب دنیا میں ایک ناقابلِ تسخیر قوت بن گیا ہوں، انھوں نے اپنا سر نہایت تواضع کے ساتھ اپنے رب کے آگے جھکا دیا کہ اے رب! اگر تو نے مجھ پر یہ فضل فرمایا ہے تو مجھے سنبھال کہ میں کہیں بہک نہ جاؤں بلکہ ہمیشہ تیرا شکرگزار اور فرمانبردار بندہ رہوں۔

حَتّٰٓى اِذَآ اَتَوْا عَلٰى وَادِ النَّمْلِ قَالَتْ نَمْلَةٌ يّٰٓاَيُّهَا النَّمْلُ ادْخُلُوْا مَسٰكِنَكُمْ لَا يَحْطِمَنَّكُمْ

سُلَیْمٰنُ وَجُنُوْدُهٗ ۙ وَهُمْ لَا یَشْعُرُوْنَ (۱۸)

وادیٔ نمل کی وضاحت

وَادِ النَّمْلِ سے کوئی مخصوص وادی بھی مراد ہو سکتی ہے جو اسی نام سے معروف رہی ہو۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ قرآن نے اس کا ذکر اس نام سے محض اس خصوص کی وجہ سے کیا ہو کہ اس میں چیونٹیاں بہت تھیں۔ چونٹیاں، چیونٹے اور اس نوع کے تمام حشرات اپنے گرھے انہی علاقوں میں بناتے ہیں جن کا ماحول ہر اعتبار سے ان کے لیے ساز گار ہو۔

حضرت سلیمانؑ حشرات کی بولی بھی سمجھتے تھے

یہ ذکر اسی پریڈ کے موقع کا ہے کہ جب حضرت سلیمانؑ کی فوجیں مارچ کرتی ہوئی چیونٹیوں کی وادی میں پہنچیں تو ایک چیونٹی نے اپنے دَل کو خطرے سے آگاہ کیا کہ اے چیونٹیو! اپنی بلوں میں گھس جاؤ، مبادا سلیمانؑ اور اس کی فوجیں تمھیں پامال کر دیں اور انھیں خبر بھی نہ ہو۔ وَهُمْ لَا یَشْعُرُوْنَ یعنی حضرت سلیمانؑ کی دَل بادل فوج کی راہ میں تو پہاڑ بھی گرد ہیں، اس کو بھلا اس بات کا احساس کہاں ہو گا کہ ہمارے حقیر وجود اس کے پاؤں تلے روندے گئے۔

چیونٹیوں کے عجائبات

چیونٹیوں کے متعلق سائنس نے جو حیرت انگیز انکشافات کیے ہیں اس سے قطع نظر ایک عام آدمی بھی اگر ان کے کسی بڑے دَل کو ایک جگہ سے دوسری جگہ نقل مکانی کرتے دیکھے تو ان کے عسکری نظام اور ڈسپلن کو دیکھ کر حیران رہ جاتا ہے۔ صاف نظر آتا ہے کہ پوری فوج ایک قائد کی قیادت میں مارچ کر رہی ہے۔ دَل کے دونوں جانب تھوڑے تھوڑے فاصلے سے ان کے رضا کاروں اور اسکاؤٹوں کی لائن ہوتی ہے جو اپنے معین حدود کے اندر برابر تگ و دو میں مصروف رہتے ہیں اور صاف نظر آتا ہے کہ وہ نگرانی کی ڈیوٹی پر مامور ہیں۔ جونہی ان کو کسی خطرے کا احساس ہوتا ہے وہ اپنے حدود کے اندر اس سے دَل کو آگاہ کرتے ہیں اور دَل اپنے آپ کو اس سے بچانے کی تدبیر اختیار کرتا ہے۔ وہ منظر ان کا خاص طور پر دیدنی ہوتا ہے جب ان کا کوئی قبیلہ مستقل طور پر ایک مقام سے دوسرے مقام کے لیے اپنے تمام غذائی ذخائر اور اپنے تمام اولاد و احفاد کے ساتھ ہجرت کرتا ہے۔ میں نے بعض مرتبہ ان کی اس مہاجرت کا غور سے مشاہدہ کیا ہے۔ اگر میں ان مشاہدات کو قلم بند کروں تو ایک طویل داستان بن جائے۔

چیونٹیوں کے یہ کارنامے تو ہما وشما کو بھی نظر آتے ہیں لیکن سائنس دانوں نے ان کے جن عجائب کا انکشاف کیا ہے۔ ان کے بعد تو اس امر میں کسی شبہے کی گنجائش ہی باقی نہیں رہ گئی ہے کہ وہ بھی، جیسا کہ قرآن میں فرمایا گیا ہے، ہماری ہی طرح امتیں ہیں۔ ان کی بعض قسمیں ہماری ہی طرح بعض جانوروں کو پالتی ہیں اور ان کو اپنے اغراض و ضروریات کے لیے استعمال کرتی ہیں۔ یہ اپنے لیے کھیت بناتی اور ان میں بیج بوتی ہیں اور جب فصل تیار ہوتی ہے تو دروکے بعد اس کو تہ خانوں میں محفوظ کر دیتی ہیں۔ ان کی باقاعدہ فوج بھی ہوتی ہے جو مخصوص افسروں کی کمان میں دشمن پر حملہ آور ہوتی ہے۔ ان کے ہاں

تربیت اور ٹریننگ کا باقاعدہ نظام ہے۔ غرض وہ ساری خصوصیات ان کے اندر بھی پائی جاتی ہیں جو انسانوں کے اندر پائی جاتی ہیں بس صرف شکل و صورت اور درجہ و مرتبہ کا فرق ہے۔

یہاں چیونٹی کی طرف جس 'قول' کی نسبت کی گئی ہے اگرچہ وہ اشاروں کی زبان سے بھی ہو سکتا ہے۔ قرآن میں یہ لفظ، جیسا کہ مریم ۲۶ کے تحت ہم واضح کر چکے ہیں، اشارے سے کوئی بات کہنے کے لیے بھی استعمال ہوا ہے۔ لیکن یہاں آیت سے متبادر یہی ہوتا ہے کہ اس سے مسموع قول مراد ہے۔ یہ امر ملحوظ رہے کہ چیونٹیوں کی صرف وہی قسمیں نہیں ہیں جن سے ہم اپنے علاقوں میں آشنا ہیں بلکہ سائنس کی تحقیقات نے جو معلومات فراہم کی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی بے شمار قسمیں مختلف علاقوں اور زمینوں میں پائی جاتی ہیں جن میں صامت و ناطق ہر قسم کی چیونٹیاں ہیں۔ حضرت سلیمانؑ جس طرح پرندوں کی بولی سمجھتے تھے اسی طرح معلوم ہوتا ہے کہ ان حشرات کی آوازیں بھی سنتے اور سمجھتے تھے۔ اور یہ علم ان کے پاس خداداد تھا۔

فَتَبَسَّمَ ضَاحِكًا مِّنْ قَوْلِهَا وَقَالَ رَبِّ أَوْزِعْنِي أَنْ أَشْكُرَ نِعْمَتَكَ الَّتِي أَنْعَمْتَ عَلَيَّ وَعَلَىٰ وَالِدَيَّ وَأَنْ أَعْمَلَ صَالِحًا تَرْضَاهُ وَأَدْخِلْنِي بِرَحْمَتِكَ فِي عِبَادِكَ الصَّالِحِينَ (۱۹)

'فَتَبَسَّمَ ضَاحِكًا'، میں لفظ 'ضحك' خوشی اور ابتہاج و سرور کے مفہوم میں ہے، جس طرح ہود آیت ۷۱ میں ہے۔ مجرد 'تَبَسَّمَ' استخفاف و تحقیر کی نوعیت کا بھی ہو سکتا ہے۔ اس کے ساتھ ضاحِکًا کی قید نے معین کر دیا کہ یہ تبسم خوشی اور سرور کی نوعیت کا تھا۔

وہ حقیقت جس کے لیے مذکورہ واقعہ بیان ہوا ہے

أَوْزِعْنِي أَنْ أَشْكُرَ الایۃ۔ 'وَزَعَ' کے معنی کی تحقیق اوپر گزر چکی ہے۔ یہاں یہ تھامنے اور سنبھالنے کے مفہوم میں ہے۔ یعنی حضرت سلیمانؑ نے یہ دعا فرمائی کہ اے رب جب تو نے میرے علم میں یہ افزونی عطا فرمائی ہے کہ میں حشرات و بہائم کی بولی بھی سمجھنے لگا ہوں تو ایسا نہ ہو کہ میں غرور و طغیان میں مبتلا ہو کر تیری راہ سے بھٹک جاؤں بلکہ تو میری باگ اپنے ہاتھ میں رکھ اور مجھے توفیق دے کہ تو نے مجھ پر اور میرے ماں باپ پر جو فضلِ عظیم فرمایا ہے میں اس کا حق ادا کر سکوں اور میرے ہاتھوں وہ کام انجام پائیں جو تیری رضا کے مطابق ہوں اور آخرت میں مجھے صالحین کی معیت حاصل ہو۔

یہی وہ اصل حقیقت ہے جس کے اظہار کے لیے اوپر والا واقعہ بیان فرمایا گیا ہے۔ جن کی نظر اسی دنیا کی زندگی تک محدود ہے اور وہ خدا سے بے خبر ہیں ان کو جب کوئی کامیابی حاصل ہوتی ہے تو وہ اس پر اتراتے اور اکڑتے ہیں گویا انھوں نے کوئی بڑا تیر مارا ہے اور پھر اس غرور اور اکڑ کا لازمی نتیجہ یہ بھی نکلتا ہے کہ وہ خدا کی بخشی ہوئی نعمتوں اور صلاحیتوں کو خدا کی رضا کے کاموں میں صرف کرنے کے بجائے شیطان کے مقصد برآری میں صرف کرتے ہیں۔ لیکن حضرت سلیمانؑ

کا حال یہ تھا کہ اپنی ہر سائنس اور کاروانی کو انھوں نے اپنے رب کا فضل جانا اور اس سے برابر ڈرتے رہے کہ ان کا کوئی قدم خدا کی پسند کے خلاف نہ اٹھے۔

وَتَفَقَّدَ الطَّيْرَ فَقَالَ مَا لِيَ لَا أَرَى الْهُدْهُدَ أَمْ كَانَ مِنَ الْغَائِبِينَ ۝ لَأُعَذِّبَنَّهُ عَذَابًا شَدِيدًا أَوْ لَأَذْبَحَنَّهُ أَوْ لَيَأْتِيَنِّي بِسُلْطَانٍ مُّبِينٍ (۲۰-۲۱)

حضرت سلیمان کی فضائی فوج

اسی پریڈ کے موقع پر جب انھوں نے اپنے پرندوں کی فوج کا جائزہ لیا تو ہدہد کو غائب پایا، اس پر غضبناک ہو کر فرمایا کہ کیا بات ہے میں ہدہد کو نہیں دیکھ رہا ہوں۔ وہ موجود ہے، مجھے نظر نہیں آیا ہے، یا غیر حاضر ہے؛ یا تو وہ اپنی اس غیر حاضری کے لیے کوئی معقول عذر پیش کرے ورنہ یا تو میں اس کو سخت سزا دوں گا یا ذبح کر چھوڑوں گا۔

'اَمْ كَانَ مِنَ الْغَآئِبِيْنَ' سے پہلے برنباے قرینہ اتنی بات محذوف ہے کہ وہ موجود ہے میں دیکھ نہیں رہا ہوں یا ..........

'سُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ' اصل میں دلیل و حجت کے مفہوم میں آتا ہے۔ یہاں یہ اپنی صفائی میں کسی عذر معقول کے لیے آیا ہے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت سلیمانؑ کی فوج میں با قاعدہ تربیت پائے ہوئے مختلف قسم کے پرندے بھی تھے جن سے وہ پیغام رسانی، سراغ رسانی اور دریافتِ احوال کی مہمات میں کام لیتے تھے اور چونکہ وہ پرندوں کی بولی سمجھتے تھے اس وجہ سے وہ موجودہ زمانے کے سائنس دانوں سے بدرجہا اعلیٰ طریقہ پر یہ کام لیتے تھے۔

تجسسِ احوال کے لیے پرندوں کی فوج

پیغام رسانی اور دریافتِ احوال وغیرہ کے سلسلے میں پرندوں سے کام لینے کا طریقہ موجودہ زمانے میں بھی موجود ہے اور قدیم زمانے میں بھی یہ پایا جاتا رہا ہے۔ اگرچہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے حالات کے ضمن میں اہلِ تورات نے اس قسم کے کسی واقعہ کا ذکر نہیں کیا ہے لیکن حضرت نوحؑ کے حالات میں یہ ذکر ہے کہ جب انھوں نے یہ اندازہ کرنا چاہا کہ طوفان کا پانی اتر گیا ہے یا نہیں تو کشتی سے ایک کبوتری اڑائی۔ کچھ دیر کے بعد وہ کبوتری اپنی چونچ میں زیتون کی ایک تازہ شاخ لے کر آئی جس سے حضرت نوحؑ نے یہ اندازہ فرمایا کہ اب پانی اتر گیا ہے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ خبر رسانی اور تجسسِ احوال وغیرہ کی مہمات کے لیے پرندوں کی تربیت کا فن بہت قدیم بلکہ ابتدائے تاریخ سے موجود ہے۔ کبوتر کی نامہ بری تو خیر معروف ہی ہے۔ حضرت نوحؑ کے مذکورہ بالا واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ پرندہ تجسسِ احوال کے مقصد کے لیے بھی بہت زیرک ہے۔ موجودہ زمانہ کی سائنس نے جو معلومات فراہم کی ہیں ان سے بھی اس خیال کی تصدیق ہوتی ہے۔ فلسطین کے علاقے میں ہدہد کی کثرت ہے۔ یہ پرندہ بھی اس مقصد کے لیے کبوتر ہی کی طرح ہوشیار ہے اس وجہ سے

حضرت سلیمانؑ نے اپنی فوج میں اس سے کام لیا۔

حضرت سلیمانؑ نے جس انداز سے ہُدہُد کی غیر حاضری پر عتاب فرمایا ہے اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ پرندے فوجی ڈسپلن کے تحت تھے۔ انھیں اس نظم کی پوری پوری پابندی کرنی پڑتی تھی اور کسی خلاف ورزی کی صورت میں انھیں فوجی ضوابط کے تحت سزا بھگتنی پڑتی تھی۔

فَمَكَثَ غَيْرَ بَعِيدٍ فَقَالَ أَحَطتُ بِمَا لَمْ تُحِطْ بِهِ وَجِئْتُكَ مِن سَبَإٍ بِنَبَإٍ يَقِينٍ إِنِّي وَجَدتُّ امْرَأَةً تَمْلِكُهُمْ وَأُوتِيَتْ مِن كُلِّ شَيْءٍ وَلَهَا عَرْشٌ عَظِيمٌ وَجَدتُّهَا وَقَوْمَهَا يَسْجُدُونَ لِلشَّمْسِ مِن دُونِ اللَّهِ وَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطَانُ أَعْمَالَهُمْ فَصَدَّهُمْ عَنِ السَّبِيلِ فَهُمْ لَا يَهْتَدُونَ (۲۲-۲۴)

ہُدہُد کی رپورٹ ملکِ سبا کے بارے میں

فَمَكَثَ غَيْرَ بَعِيدٍ۔ 'مَكَثَ' کا فاعل، میرے نزدیک، حضرت سلیمانؑ ہیں۔ یعنی ہُدہُد پر جو عتاب انھوں نے فرمایا اس کے بعد زیادہ دیر نہیں گزری کہ ہدہد آگیا اور اس نے اپنی کارگزاری کی یہ رپورٹ پیش کی کہ میں ملک سبا سے ایک ایسی سچی اطلاع لے کر آیا ہوں جو حضور کے علم میں نہیں ہے۔ سبا عرب کا وہی مغربی جنوبی علاقہ ہے جہاں یمن، حضرموت اور عسیر واقع ہیں۔ ہُدہُد کے قول کا یہ مطلب نہیں تھا کہ حضرت سلیمانؑ اس ملک اور اس کے حالات سے بالکل ہی بے خبر ہیں۔ اتنے قریب کے ملک سے حضرت سلیمانؑ بالکل بے خبر کیسے ہو سکتے تھے جب کہ تورات اور قرآن دونوں سے یہ بات ثابت ہے کہ ملکۂ سبا حضرت سلیمانؑ کے حالات اور ان کی حکمت سے، جیسا کہ آگے وضاحت آرہی ہے، فی الجملہ واقف تھیں۔ جب ملکۂ سبا واقف تھیں تو حضرت سلیمانؑ کے ناواقف ہونے کے کیا معنی جن کا بحری بیڑا دور دور کے ممالک تک سفر کرتا تھا۔ ہدہد کا مطلب یہ تھا کہ اس ملک سے متعلق میں تازہ تفصیلی رپورٹ لے کر آیا ہوں جس سے حضور کی معلومات میں اضافہ ہوگا۔ 'أَحَطتُ بِمَا لَمْ تُحِطْ بِهِ' کے الفاظ سے بھی یہی بات نکلتی ہے۔ ان الفاظ کا صحیح مدعا یہ ہے کہ حضور والا اس ملک سے متعلق جو کچھ جانتے ہیں میں اس سے کچھ زائد معلومات حاصل کر کے آیا ہوں۔ یہ امر ملحوظ رہے کہ ہُدہُد نے یہ بات اپنی غیر حاضری کے عذر کے طور پر پیش کی ہے اس وجہ سے اس نے اپنی رپورٹ کا قابلِ وثوق ہونا بھی واضح کیا اور تازہ معلومات پر مشتمل ہونا بھی۔ اس طرح کا اضافہ ہر ملک کا سفیر اور مخبر اپنے ملک کے حکمران کی معلومات میں کرتا ہے اور کر سکتا ہے اس وجہ سے اس میں حضرت سلیمانؑ کے علم اور ان کی معلومات کی تحقیر کا کوئی پہلو نہیں ہے۔

'إِنِّي وَجَدتُّ امْرَأَةً ....... الآیۃ' ملک کے حکمران سے متعلق اس نے یہ رپورٹ دی کہ ان پر ایک عورت حکومت کر رہی ہے اور اندازِ کلام سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ عورت کی حکمرانی اس کی نظر میں ایک تعجب انگیز امر ہے۔ ملک کے وسائل و ذرائع سے متعلق اس نے یہ رپورٹ دی کہ 'وَأُوتِيَتْ مِن كُلِّ شَيْءٍ' یعنی ملک کی رفاہیت و ترقی سے متعلق جو چیزیں ضروری ہیں وہ سب اس کو حاصل ہیں۔ ملک کی عظمت سے متعلق اس نے یہ رپورٹ دی کہ 'لَهَا عَرْشٌ عَظِيمٌ' اس کا تخت بہت بڑا ہے۔

یہ امر ملحوظ رہے کہ اس زمانے کے بادشاہوں کے تخت و تاج چونکہ سونے چاندی اور زر و جواہر سے آراستہ ہوتے تھے اس وجہ سے ان کی بڑائی بیشتر انہی چیزوں کی بڑائی سے ناپی جاتی تھی۔

ملک کی مذہبی و اخلاقی حالت سے متعلق اس نے یہ رپورٹ دی کہ ملکہ اور اس کی قوم کے لوگ سب آفتاب پرست ہیں اور یہ آفتاب پرستی اور ان کے دوسرے اعمال و اخلاق اس طرح شیطان نے ان کی نگاہوں میں کھبا دیے ہیں کہ صحیح راہ ــــ توحید اور خدا پرستی کی راہ ــــ ان کو سجھائی نہیں دے رہی ہے۔

اَلَّا يَسْجُدُوا لِلّٰهِ الَّذِي يُخْرِجُ الْخَبْءَ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَيَعْلَمُ مَا تُخْفُوْنَ وَمَا تُعْلِنُوْنَ ۝ اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ (۲۵-۲۶)

ایک تضمین

میرے نزدیک یہ دو آیتیں ہُدہُد کے قول کا جزو نہیں ہیں بلکہ یہ اسی قسم کی تضمین ہے جس کی متعدد مثالیں پیچھے گزر چکی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ہُدہُد کی بات فَصَدَّهُمْ عَنِ السَّبِيْلِ کے ساتھ اس بات کو ملا کر کلام کو بالکل مطابق حال کر دیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ شیطان نے ان کو اس خدا کی بندگی سے روک دیا جو آسمان و زمین کی تمام مخفیات کو بے نقاب کرتا ہے اور جو تمہارے تمام سر و علانیہ سے اچھی طرح واقف ہے۔ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔ عرش عظیم کا مالک وہی ہے۔

اس کے تضمین ہونے کے قرائن بالکل واضح ہیں، ان کی مزید وضاحت تحصیل حاصل ہو گی۔ مَا تُخْفُوْنَ وَمَا تُعْلِنُوْنَ کے صیغہ ہائے خطاب ہُدہُد کی زبان سے بالکل ناموزوں ہیں۔ یہ اللہ تعالیٰ ہی فرما سکتا تھا۔

يُخْرِجُ الْخَبْءَ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ' میں خَبْءٌ 'مَخْبُوْءٌ' کے مفہوم میں ہے۔ یعنی زمین و آسمان کی تمام پوشیدہ چیزوں کو بے نقاب تو اللہ تعالیٰ کرتا ہے لیکن نادان لوگ پوجا غیر اللہ کی کرتے ہیں۔ آسمان کی پوشیدہ چیزوں سے یہاں اشارہ سورج، چاند، زہرہ، مشتری اور بارش وغیرہ کی طرف خاص طور سے ہے جن میں سے سورج کی پوجا سب سے بڑے دیوتا کی حیثیت سے، اہل سبا کرتے تھے۔ زمین کی پوشیدہ چیزوں سے اشارہ ان چیزوں کی طرف ہے جو اس سے اگتی یا برآمد ہوتی ہیں۔ مثلاً درخت، نباتات دریا اور چشمے وغیرہ۔ فرمایا کہ ان تمام چیزوں کا خالق و مالک تو اللہ وحدہٗ لاشریک ہے اور وہ تمہارے تمام پوشیدہ و علانیہ سے واقف بھی ہے تو دوسری چیزوں کی بندگی کرنے کے کیا معنی!

لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ۔ یعنی اصل عرش عظیم کا، جو تمام آسمانوں اور زمین پر حاوی ہے، مالک وہی ہے تو اسی کی بندگی کرو۔ اس کے عرش کے آگے کسی کے عرش کی بھی، خواہ وہ کتنا ہی بڑا ہو، کوئی وقعت و حیثیت نہیں ہے۔

قَالَ سَنَنْظُرُ اَصَدَقْتَ اَمْ كُنْتَ مِنَ الْكٰذِبِيْنَ ۝ اِذْهَبْ بِّكِتٰبِيْ هٰذَا فَاَلْقِهْ اِلَيْهِمْ ثُمَّ تَوَلَّ عَنْهُمْ فَانْظُرْ مَاذَا يَرْجِعُوْنَ (۲۷-۲۸)

ایک قرین قیاس بات

حضرت سلیمان علیہ السلام نے فرمایا، جلد ہی تمہارے سچے یا جھوٹے ہونے کا امتحان ہوا جاتا ہے۔

میرا یہ نامہ لے کر جاؤ اور ان کے آگے ڈال دو۔ پھر پرے ہٹ کر دیکھو کہ وہ کیا ردِ عمل ظاہر کرتے ہیں مطلب یہ ہے کہ اس کے بعد ان کی طرف سے کوئی نہ کوئی ردِ عمل لازماً ظاہر ہوگا جس سے یہ اندازہ ہو جائے گا کہ تم نے یوں ہی سبا تک جانے کی بڑ ہانکی ہے یا اس میں کچھ حقیقت بھی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حکومت سبا کا مسئلہ پہلے سے حضرت سلیمان علیہ السلام کے زیرِ غور تھا اور عجب نہیں کہ اس کے زیرِ غور ہی ہونے کے سبب سے ہُدہُد نے اس ملک کے حالات کے جائزہ کے لیے یہ پرواز کی ہو۔ اگر پہلے سے کوئی اسکیم نہ ہوتی تو یہ بات بعید از قیاس ہے کہ مجرد ہُدہُد کے صدق و کذب کی جانچ کے لیے حضرت سلیمان علیہ السلام ملکۂ سبا کو الٹی میٹم بھیج دیں۔ آگے اس خط کا حوالہ آ رہا ہے اور اس کی نوعیت بالکل الٹی میٹم کی ہے۔

ثُمَّ تَوَلَّ عَنْهُمْ فَانْظُرْ کی ہدایت کا مدعا صرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ خط ان کے سامنے ڈال کر فوراً وہاں سے واپس نہ آجانا بلکہ یہ جائزہ لینے کی بھی کوشش کرنا کہ اس خط پر ان کا ردِ عمل کیا ہوتا ہے بعض لوگوں نے یہ سمجھا ہے کہ یہ پرے ہٹنے کی ہدایت ہُدہُد کو حضرت سلیمانؑ نے اس لیے فرمائی کہ وہ لوگ بے تکلف اظہارِ خیال کر سکیں اور ایک غیر ملک کے قاصد کی موجودگی کے باعث کوئی جھجک نہ محسوس کریں لیکن یہ بات صحیح نہیں معلوم ہوتی۔ اس زمانے میں پرندوں کے ذریعہ سے نامہ بری تو ایک معروف بات تھی لیکن یہ بات کہ حضرت سلیمانؑ کا نامہ بر ہُدہُد باتوں کو سنتا اور سمجھتا بھی ہے کم از کم اس مرحلے تک ملکِ سبا کے لوگوں کے علم میں اس کے ہونے کا کوئی قرینہ موجود نہیں ہے۔

قَالَتْ يٰۤاَيُّهَا الْمَلَؤُا اِنِّيْۤ اُلْقِيَ اِلَيَّ كِتٰبٌ كَرِيْمٌ ۝ اِنَّهٗ مِنْ سُلَيْمٰنَ وَاِنَّهٗ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝ اَلَّا تَعْلُوْا عَلَيَّ وَاْتُوْنِيْ مُسْلِمِيْنَ (۲۹-۳۱)

حضرت سلیمانؑ کا نامہ ملکۂ سبا کے نام

نامہ کے موصول ہونے کے بعد ملکہ نے فوراً اپنے درباریوں سے مشورہ کیا۔ ان کو بتایا کہ اِنِّيْۤ اُلْقِيَ اِلَيَّ كِتٰبٌ كَرِيْمٌ (میرے پاس ایک معزز گرامی نامہ ڈلوایا گیا ہے) اس اندازِ تعارف سے دو باتیں واضح ہوتی ہیں۔

ایک یہ کہ پرندوں کے ذریعہ سے خطوط بھیجنے اور بھجوانے کا طریقہ اس زمانے میں کم از کم بادشاہوں کے ہاں، ایک معلوم و معروف طریقہ تھا۔ اگر یہ بات نہ ہوتی تو ملکہ کو بھی اس طرح، بغیر کسی قاصد کے، خط آنے پر تعجب ہوتا اور درباری بھی اس پر تعجب کا اظہار کرتے لیکن نفسِ خط کے وصول ہونے پر نہ ملکہ نے کسی تعجب کا اظہار کیا نہ ان کے درباریوں نے بلکہ ملکہ نے بھی اس کا ذکر ایک عام واقعہ کی حیثیت سے کیا اور درباریوں نے بھی اس کو عادی واقعہ ہی کی حیثیت سے سنا۔

دوسری یہ کہ ملکہ نے اس خط کا ذکر ایک معزز خط کی حیثیت سے کیا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ صاحبِ خط ـــ حضرت سلیمانؑ ـــ کی عزت و عظمت ان کے اور ان کے درباریوں کے دل میں پہلے سے موجود تھی۔ اس کے شواہد تورات اور زبور میں بھی موجود ہیں۔ اور آگے قرآن میں بھی اس کے اشارات آرہے ہیں۔

اِنَّهٗ مِنْ سُلَيْمٰنَ وَاِنَّهٗ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ یہ ملکہ نے اصل خط کا خلاصہ پیش کیا کہ یہ سلیمان کی جانب سے ہے اور اس کا آغاز بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ سے ہوا ہے۔ قدیم زمانے کے سلاطین و امراء کے خطوط و فرامین کا طریقہ یہی رہا ہے کہ ان کا آغاز مُرسل اور مُرسل الیہ کے نام سے ہوتا۔ ملکہ نے چونکہ خط کا پورا متن نہیں بلکہ خلاصہ ہی پیش کیا اس وجہ سے مرسل کے نام اور اس کے بعد خاص طور پر اس کے بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ سے شروع ہونے کا ذکر کیا۔ اس سے بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ کی تاریخ پر بھی روشنی پڑتی ہے اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ملکہ نے خط کے اس سرنامہ کو خاص طور پر اہمیت دی اور یہ چاہا کہ اس کے اندر جو دعوتی روح ہے اس کو اس کے درباری بھی سمجھیں۔

اَلَّا تَعْلُوْا عَلَيَّ وَاْتُوْنِيْ مُسْلِمِيْنَ۔ یہ حضرت سلیمانؑ کے خط کا اصل مدعا ملکہ نے بتایا کہ ان کا مطالبہ یہ ہے کہ میرے مقابل میں سرکشی نہ کرو بلکہ میری اطاعت میں داخل ہو جاؤ۔

اگرچہ قرینہ سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ ملکہ نے حضرت سلیمانؑ کے خط کا خلاصہ پیش کیا ہے لیکن یہ بھی ایک امر واقعہ ہے کہ قدیم زمانے میں خطوط اور فرامین طویل نہیں لکھے جاتے تھے بلکہ نہایت مختصر اور قل و دل ہوتے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خطوط سے بھی اسی کی شہادت ملتی ہے اس وجہ سے اگر حضرت سلیمانؑ کا خط اتنا ہی رہا ہو جب بھی کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔

**حضرت سلیمانؑ کا مطالبہ اہل سبا سے**

تورات کی کتاب سلاطین سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے زمانہ میں ان کے گرد و پیش کی تمام ریاستیں اور حکومتیں یا تو از خود ان کی باجگزار اور ماتحت بن گئی تھیں یا حضرت سلیمانؑ نے ان کو طاقت کے زور سے اپنے زیرنگین کر لیا تھا اور ایسا انھوں نے اس اصول کے تحت کیا تھا کہ کفر و شرک کا اقتدار خدا کی زمین میں سب سے بڑا فساد ہے جس کو مغلوب کرنا اہل حق کے فرائض میں سے ہے۔ اس اصول کے تحت اہل سبا سے بھی انھوں نے مطالبہ کیا کہ وہ سیدھے سیدھے ان کی ماتحتی میں داخل ہو جائیں، سرکشی کی روش نہ اختیار کریں کہ ان کے خلاف ان کو کوئی اقدام کرنا پڑے۔ 'مُسْلِمِيْنَ' یہاں اطاعت اور فرمانبرداری کے مفہوم میں ہے۔ اسلام لانے کے مفہوم میں نہیں ہے۔ ایک صحیح اسلامی حکومت کو یہ حق تو حاصل نہیں ہے کہ وہ غیر مسلموں کو اسلام لانے پر مجبور کرے لیکن اس کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ غیر مسلموں کو اقتدار پر متمکن نہ رہنے دے۔ اس کی وجہ وہی ہے جس کی طرف ہم نے اوپر اشارہ کیا کہ خدا کی زمین میں خدا کے قانون کے سوا کسی اور قانون کی بالادستی خدا سے بغاوت اور فساد فی الارض ہے۔

قَالَتْ يٰٓاَيُّهَا الْمَلَؤُا اَفْتُوْنِيْ فِيْٓ اَمْرِيْ ۚ مَا كُنْتُ قَاطِعَةً اَمْرًا حَتّٰى تَشْهَدُوْنِ (۳۲)

**ملکہ سبا کا مشورہ اپنے درباریوں سے**

خط کا مضمون سنا کر ملکہ نے درباریوں سے مشورہ طلب کیا کہ آپ لوگ اس معاملے میں رائے دیجیے کہ مجھے کیا رویہ اختیار کرنا چاہیے؟ اور ساتھ ہی اہل دربار کی دلجوئی و استمالت کے لیے یہ بھی کہا کہ میں کسی اہم معاملے کا فیصلہ اس وقت تک نہیں کرتی جب تک آپ لوگوں کی موجودگی میں آپ لوگوں کا مشورہ نہ حاصل

کر لوں۔ اس دل جوئی کی ضرورت ملکہ نے غالباً اس لیے محسوس کی کہ وہ حضرت سلیمان علیہ السلام سے جنگ کے لیے، جیسا کہ آگے کے حالات سے واضح ہوگا، تیار نہیں تھیں اور ان کی یہ خواہش تھی کہ ان کے اعیان بھی معاملہ پر اسی طرز سے سوچیں جس طرز سے وہ سوچ رہی ہیں۔

یہ امر ملحوظ رہے کہ کوئی شخصی حکومت بھی اس معنی میں شخصی نہیں ہوا کرتی کہ بادشاہ اپنی ذات کے سوا ہر شخص سے بالکل مستغنی ہو۔ اس معنی میں شخصی تو فرعون کی حکومت بھی نہیں تھی۔ آخر وہ بھی اپنے اعیان اور درباریوں سے مشورہ کرتا تھا اسی طرح ملکۂ سبا نے بھی اپنے اعیان سے مشورہ کیا۔ اس سے یہ نتیجہ نکالنا کہ ملکۂ سبا کی حکومت جمہوری یا شورائی تھی ہمارے نزدیک صحیح نہیں ہے۔ اس کو کہہ سکتے ہیں تو اعیانی حکومت کہہ سکتے ہیں اور وہ بھی ایک خاص مفہوم میں۔

قَالُوْا نَحْنُ اُولُوْا قُوَّةٍ وَّاُولُوْا بَاْسٍ شَدِیْدٍ ۙ۬ وَّالْاَمْرُ اِلَیْكِ فَانْظُرِیْ مَاذَا تَاْمُرِیْنَ (۳۳)

درباریوں کا مشورہ

درباریوں نے کہا کہ ہم وسائل جنگ اور افراد کی تعداد کے اعتبار سے بھی طاقتور ہیں اور ہمارے آدمی جنگی مہارت و بسالت کے اعتبار سے بھی ممتاز و نامور ہیں تو آپ اگر جنگ کا فیصلہ فرمائیں تو ہم حریف سے بیٹھے نہیں ہیں لیکن فیصلہ بہر حال آپ کے اختیار میں ہے۔ آپ غور فرما لیجیے کہ کیا حکم دیتی ہیں۔

'اُولُوْا قُوَّةٍ' سے انھوں نے اپنی عددی قوت اور وسائل جنگ کی طرف اشارہ کیا اور 'اُولُوْا بَاْسٍ شَدِیْدٍ' سے اپنی جنگی مہارت و بصیرت اور جرات و بسالت کی طرف۔ جنگ کے لیے یہی دو چیزیں درکار ہوتی ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ درباریوں کا رجحان جنگ کی طرف تھا اور انھوں نے اپنا یہ رجحان ملکہ کے سامنے ظاہر کر دیا۔

قَالَتْ اِنَّ الْمُلُوْكَ اِذَا دَخَلُوْا قَرْیَةً اَفْسَدُوْهَا وَجَعَلُوْۤا اَعِزَّةَ اَهْلِهَاۤ اَذِلَّةً ۚ وَكَذٰلِكَ یَفْعَلُوْنَ (۳۴)

ملکہ کی رائے

ملکہ نے درباریوں کے اس رجحان کی تائید نہیں کی۔ حضرت سلیمانؑ کی قوت و صولت اور ان کی دانش و حکمت سے متعلق ان کو بہت سی باتیں پہنچ چکی تھیں۔ اس وجہ سے جنگ کے رجحان کی انھوں نے حوصلہ شکنی کی اور اس کے عواقب سے اپنے درباریوں کو ڈرایا کہ بادشاہ لوگ جب کسی ملک یا شہر کو فتح کرتے ہیں تو اس کو بالکل تلپٹ کر کے رکھ دیتے ہیں اور ان کے ہاتھوں ملک کے معززین کو ذلیل و خوار ہونا پڑتا ہے۔ بعض حضرت سلیمانؑ اور ان کے فوجی بھی لازماً یہی کریں گے۔ مطلب یہ ہے کہ جنگ سے احتراز ہی میں خیر ہے۔

وَاِنِّیْ مُرْسِلَةٌ اِلَیْهِمْ بِهَدِیَّةٍ فَنٰظِرَةٌۢ بِمَ یَرْجِعُ الْمُرْسَلُوْنَ (۳۵)

ملکہ کی مصالحت کی پالیسی

ملکہ نے جنگ کے بجائے مصالحت و استمالت کی پالیسی اختیار کرنے کا مشورہ دیا اور کہا کہ میں پہلے اپنے سفیروں کے ذریعے سے حضرت سلیمانؑ کے پاس تحفے بھیجتی ہوں اور دیکھتی ہوں کہ ہمارے اس جذبۂ خیرسگالی کا ان پر کیا اثر پڑتا ہے اور ہمارے سفیر ان کی طرف سے کیا جواب لے کر لوٹتے ہیں۔

'فَنٰظِرَةٌۢ بِمَ یَرْجِعُ الْمُرْسَلُوْنَ' سے یہ بات مترشح ہوتی ہے کہ ملکہ کو اپنی اس سفارت کی کامیابی

کی کچھ زیادہ توقع نہیں تھی۔ وہ جانتی تھیں کہ حضرت سلیمانؑ کے سامنے سوال اصول کا ہے۔ ان کو تحفوں اور ہدیوں سے رام کرنا ممکن نہیں ہے لیکن وہ جنگ سے بچ کر معاملے کو طے کرنے کی کوئی ایسی راہ نکالنا چاہتی تھیں جو ان کے اور ان کے اہل ملک کے لیے بہتر ہو اور یہ دلیل ہے اس بات کی کہ ان کے مزاج میں سلامت روی اور عاقبت بینی تھی۔

فَلَمَّا جَآءَ سُلَيْمٰنَ قَالَ اَتُمِدُّوْنَنِ بِمَالٍ فَمَآ اٰتٰىنِۦَ اللّٰهُ خَيْرٌ مِّمَّآ اٰتٰىكُمْ بَلْ اَنْتُمْ بِهَدِيَّتِكُمْ تَفْرَحُوْنَ (۳۶)

حضرت سلیمانؑ کا جواب ملکۂ سبا کے وفد کو

ملکہ نے اپنی تجویز کے مطابق تحائف و ہدایا کے ساتھ ایک وفد حضرت سلیمانؑ کی خدمت میں بھیجا۔ 'جَآءَ' واحد کا صیغہ وفد کے لحاظ سے آیا ہے۔ یعنی 'فَلَمَّا جَآءَ مَنْ اُرْسِلَ اِلَيْهِ' ملکہ کے اوپر کے الفاظ سے بھی معلوم ہوتا ہے اور حضرت سلیمانؑ کے آگے کے الفاظ سے بھی واضح ہوتا ہے کہ ایک پورا وفد حضرت سلیمانؑ کی خدمت میں حاضر ہوا تھا۔ لیکن حضرت سلیمانؑ نے ان کے تحائف و ہدایا قبول نہیں فرمائے۔ بلکہ صاف لفظوں میں ان کو جواب دے دیا کہ آپ لوگ مال سے میری مدد کرنا چاہتے ہیں، میں مال کا محتاج نہیں ہوں۔ مجھے میرے رب نے جو کچھ دے رکھا ہے وہ اس سے کہیں بڑھ کر ہے جو آپ لوگوں کے پاس ہے۔ 'فَمَآ اٰتٰىنِۦَ اللّٰهُ' کے اجمال میں مال و جاہ اور حکمت و حکومت کی وہ ساری نعمتیں شامل ہیں جو حضرت سلیمانؑ کو حاصل تھیں۔ انھوں نے فرمایا کہ اس قسم کے ہدیوں اور تحفوں سے آپ ہی لوگ خوش ہوتے ہیں۔ میں اس کا متمنی نہیں ہوں۔

حضرت سلیمانؑ کے اس ارشاد کا مطلب یہ تھا کہ میرا مطالبہ آپ کی ملکہ اور آپ کی حکومت سے اطاعت کا ہے۔ میں صرف دوستی کا خواہشمند نہیں ہوں کہ ان تحفوں سے خوش ہو جاؤں کہ ہمارے درمیان دوستی کی رسم و راہ قائم ہو گئی۔ مال و متاع میرے پاس بہت ہے اور وہ بہر شکل آپ لوگوں کے مال سے بہتر ہے۔ آپ لوگ تو اس طرح کی چیزوں سے خوش ہوتے ہیں اس لیے کہ آپ لوگوں کی نظر میں ساری قدر انہی چیزوں کی ہے لیکن میرے پیش نظر اعلائے کلمۃ اللہ ہے۔ میرے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ میں تحفوں سے خوش ہو کر شرک و کفر کے اقتدار کو خدا کی زمین پر جائز تسلیم کر لوں۔

اِرْجِعْ اِلَيْهِمْ فَلَنَاْتِيَنَّهُمْ بِجُنُوْدٍ لَّا قِبَلَ لَهُمْ بِهَا وَلَنُخْرِجَنَّهُمْ مِّنْهَآ اَذِلَّةً وَّهُمْ صٰغِرُوْنَ (۳۷)

حضرت سلیمانؑ نے رئیسِ وفد کو یہ جواب دیا کہ تم اپنی ملکہ اور ان کے اعیان کے پاس جاؤ۔ ہم ان پر ایسی افواج قاہرہ سے حملہ کریں گے جن کے مقابلہ کی تاب وہ نہ لا سکیں گے اور ان کو اس ملک سے اس طرح ذلیل کر کے نکالیں گے کہ وہ خود اپنی نظروں میں خوار ہو کر رہ جائیں گے۔

'قِبَلٌ' کے معنی قوت، طاقت اور مقدرت کے ہیں۔ حضرت سلیمانؑ کا اپنے قاصد کے ذریعہ سے یہ

بات معلوم ہو چکی تھی کہ ملکۂ سبا کے درباریوں کو اپنے اسباب و وسائل اور اپنی شجاعت و بسالت پر بڑا ناز ہے۔ اس وجہ سے انھوں نے ان کو آگاہ فرمایا کہ میری فوج کے مقابلہ میں ان کا یہ سارا غرّہ ختم ہو جائے گا۔

'اَذِلَّةً' کے ساتھ 'وَهُمْ صٰغِرُوْنَ' کے اضافہ سے یہ بات نکلتی ہے کہ میری فوجیں اس طرح ان کو ذلیل کر کے ملک سے نکالیں گی کہ وہ خود اپنی نظروں میں بھی خوار ہو کے رہ جائیں گے۔ بسا اوقات یہ ہوتا ہے کہ ایک قوم جنگ میں تو شکست کھا جاتی ہے لیکن اس کا حوصلہ باقی رہتا ہے۔ حضرت سلیمانؑ کے ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ میری فوجیں اس طرح ان کے کس بل نکال دیں گی کہ پھر یہ جنگ کا کبھی نام بھی لینے کی جرأت نہیں کریں گے۔

قَالَ يٰۤاَيُّهَا الْمَلَؤُا اَيُّكُمْ يَاْتِيْنِيْ بِعَرْشِهَا قَبْلَ اَنْ يَّاْتُوْنِيْ مُسْلِمِيْنَ (۳۸)

حضرت سلیمانؑ کی ایک خاص تدبیر

سفیروں کو واپس کر دینے کے بعد حضرت سلیمانؑ نے یہ اندازہ اچھی طرح فرما لیا کہ یہ لوگ جنگ کا خطرہ مول لینے کی جرأت نہیں کریں گے بلکہ بہت جلد ان کے مطالبہ کے آگے سرِ تسلیم خم کر دیں گے۔ اس سے پہلے پہلے انھوں نے یہ چاہا کہ ملکہ اور ان کے درباریوں کے سامنے ان کی طرف سے کوئی ایسی بات ظاہر ہو جائے جو ان کو بالکل ہی مرعوب کر دے۔ چنانچہ انھوں نے یہ ارادہ فرمایا کہ ملکہ کے اس تخت کو، جس کی شان و عظمت کی ان کے قاصد نے خبر دی تھی، اپنے دربار میں منگوا لیں۔ اس کے لیے انھوں نے اپنے درباریوں سے فرمایا کہ تم میں سے ایسا کون ہے جو ملکہ کے تخت کو، قبل اس کے کہ وہ لوگ میرے پاس فرماں بردارانہ آئیں حاضر کر دے؟

قَالَ عِفْرِيْتٌ مِّنَ الْجِنِّ اَنَا اٰتِيْكَ بِهٖ قَبْلَ اَنْ تَقُوْمَ مِنْ مَّقَامِكَ ۚ وَاِنِّيْ عَلَيْهِ لَقَوِيٌّ اَمِيْنٌ (۳۹)

'عِفْرِيْتٌ' کے معنی کارواں، شاطر اور چالاک کے ہیں اور ساتھ ہی اس کے اندر تگڑے، زور آور اور لیڈر ہونے کا مفہوم بھی پایا جاتا ہے اس وجہ سے میں نے اس کا ترجمہ سرہنگ کیا ہے۔

جنوں کے ایک سرہنگ کی پیشکش

یہ بحث اپنے مقام میں گزر چکی ہے کہ حضرت سلیمانؑ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک ایسا علم بھی عطا ہوا تھا جس کے ذریعہ سے انھوں نے بہت سے جنوں کو مسخر کر کے اپنی حکومت کی مختلف قسم کی خدمات میں لگا رکھا تھا۔ جب حضرت سلیمانؑ نے درباریوں کے سامنے مذکورہ بالا خواہش کا اظہار کیا تو اس کی تعمیل کے لیے سب سے پہلے ایک شاطر جن نے اپنی خدمات پیش کیں کہ اگر حضور یہ خدمت میرے سپرد فرمائیں تو میں آپ کی اس مجلس کے برخاست ہونے سے پہلے پہلے ملکہ کے تخت کو حاضر کر سکتا ہوں۔ ساتھ ہی اس نے یہ اطمینان بھی دلایا کہ میں اس تخت کو اٹھا لانے کی قوت بھی رکھتا ہوں اور دیانت دار بھی ہوں اس وجہ سے حضور اطمینان رکھیں کہ میں اس میں کوئی تصرف نہیں کروں گا۔

قَالَ الَّذِيْ عِنْدَهٗ عِلْمٌ مِّنَ الْكِتٰبِ اَنَا اٰتِيْكَ بِهٖ قَبْلَ اَنْ يَّرْتَدَّ اِلَيْكَ طَرْفُكَ ۚ فَلَمَّا رَاٰهُ مُسْتَقِرًّا عِنْدَهٗ قَالَ هٰذَا مِنْ فَضْلِ رَبِّيْ ۫ لِيَبْلُوَنِيْۤ ءَاَشْكُرُ اَمْ اَكْفُرُ ۚ وَمَنْ شَكَرَ فَاِنَّمَا يَشْكُرُ

لِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ كَفَرَ فَاِنَّ رَبِّيْ غَنِيٌّ كَرِيْمٌ (۴۰)

ایک عالم کتاب کا کارنامہ

جب ایک جن نے یہ پیشکش کی تو دربار کے ایک عالم کتاب کی غیرت جوش میں آگئی۔ انھوں نے فرمایا کہ یہ کیا بات ہوئی! یہ دربار کے برخاست ہونے تک تخت کے لانے کا وعدہ کرتا ہے میں آپ کی پلک جھپکتے اس کو حاضر کیے دیتا ہوں۔ اتنے میں حضرت سلیمانؑ نے دیکھا کہ تخت ان کے سامنے موجود ہے۔

علم کتاب سے مراد ظاہر ہے کہ خدا کی کتاب و شریعت یعنی تورات کا علم ہے۔ اس عالم کتاب کو معلوم ہوتا ہے کہ اس علم میں بھی درخور حاصل تھا جس کا ذکر ہم سورۂ بقرہ کی تفسیر میں، ہاروت و ماروت کے ضمن میں، وضاحت سے کر چکے ہیں۔ ہمارے نزدیک یہ خواص کلمات و اسمائے الٰہی کا علم ہے جو سحر و شعبدے وغیرہ جیسے علوم سفلیہ کے مقابلہ کے لیے دو فرشتوں کے ذریعہ سے بنی اسرائیل کو بابل کی اسیری کے زمانہ میں، عطا ہوا تھا۔ یہ علم بجائے خود پاکیزہ ہے لیکن اس کی نوعیت ایک شمشیر دودم کی ہے جس کو فاسد اغراض میں استعمال کر کے انسان فتنہ میں پڑ سکتا ہے۔ چنانچہ بقرہ میں یہ وضاحت ہو چکی ہے کہ فرشتوں نے اس علم کو فتنہ سے تعبیر بھی فرمایا تھا۔ حضرت سلیمانؑ کے زمانے تک تورات کے شدید احتساب کے سبب سے اس علم کو کوئی غلط مقاصد میں استعمال کرنے کی جرأت نہ کر سکا لیکن بقرہ میں اس بات کی تصریح ہے کہ حضرت سلیمانؑ کے بعد یہود اسی علم کے ہو کے رہ گئے۔ تورات سے ان کو کوئی دلچسپی باقی نہیں رہی بلکہ مزید ستم یہ کیا کہ اس کو انھوں نے عملیات سفلیہ کا ضمیمہ بنا لیا اور اپنے عوام کو یہ باور کرایا کہ حضرت سلیمانؑ کی تمام عظمت و شوکت انھی چیزوں کے بل پر قائم تھی۔

یہ علم، تورات یا آسمانی صحیفوں کا کوئی حصہ نہیں ہے بلکہ یہ ان سے الگ ہے۔ یہ ایک خاص دور میں، ایک خاص ضرورت و مصلحت کے تحت، بنی اسرائیل کو عطا ہوا تھا جس کی وضاحت بقرہ کی تفسیر میں ہم کر چکے ہیں۔ یہاں اَلَّذِيْ عِنْدَهٗ عِلْمٌ مِّنَ الْكِتٰبِ سے مقصود صرف یہ ظاہر کرنا ہے کہ کتاب و شریعت کے علم کے ساتھ بھی ایسا علم حاصل کیا جا سکتا ہے جس کی تاثیر و تسخیر کا مقابلہ شیاطین جن و انس اپنی عملیات سفلیہ کے زور سے نہیں کر سکتے۔

حضرت سلیمانؑ کی شکر گزاری

فَلَمَّا رَاٰهُ مُسْتَقِرًّا عِنْدَهٗ - الآیۃ یہ وہ اصل مدعا ہے جس کے لیے یہ واقعہ سنایا گیا ہے کہ جب حضرت سلیمان علیہ السلام نے دیکھا کہ فی الواقع ملکہ سبا کا تخت ان کے سامنے موجود ہے، اور اس کے لیے نہ انھیں خود کچھ کرنا پڑا اور نہ کسی جن و شیطان سے ان کو مدد لینی پڑی بلکہ ان کے دربار کے ایک عالم کتاب نے اللہ کے نام و کلمات کے ذریعے سے، یہ کارنامہ کر دکھایا تو بجائے اس کے کہ وہ اس پر مغرور ہوں اور اترائیں وہ فوراً پکار اٹھے کہ یہ سب میرے رب کا فضل ہے اور وہ یہ فضل کر کے میرا امتحان کر رہا ہے کہ میں اس کا شکر گزار و فرماں بردار بندہ بنتا ہوں یا ناشکرا! جو شخص نعمت پا کر خدا کا شکر گزار رہتا ہے وہ خدا کو کوئی نفع نہیں پہنچاتا بلکہ اپنے ہی کو نفع پہنچاتا ہے۔ میرا رب تو بالکل بے نیاز ہے لیکن اس بے نیازی کے

ساتھ ساتھ وہ کریم بھی ہے اس وجہ سے وہ ان لوگوں کو بھی اپنی نعمتوں سے محروم نہیں کرتا جو اس کی بخشی ہوئی نعمتوں کو اس کے خلاف بغاوت کے لیے استعمال کرتے ہیں۔

قَالَ نَكِّرُوا لَهَا عَرْشَهَا نَنظُرْ أَتَهْتَدِي أَمْ تَكُونُ مِنَ الَّذِينَ لَا يَهْتَدُونَ (۴۱)

حضرت سلیمانؑ کا ایک تفنن

حضرت سلیمانؑ کے پیش نظر تخت کے منگوا لینے سے مقصود مجرد اس کا منگوا لینا تو تھا نہیں بلکہ وہ اس طرح ملکہ اور اس کے اعیان کے سامنے اس علم حق کی سطوت کا مظاہرہ کرنا چاہتے تھے جو اللہ تعالیٰ نے ان کو بخشا تھا۔ انھوں نے چاہا کہ جب ملکہ آئیں تو وہ اس تخت کو دکھا کر ان سے پوچھیں کہ جس تخت پر آپ فروکش ہوتی ہیں وہ اسی طرح کا ہے یا اس سے کچھ مختلف ہے! یہ ایک قسم کا تفنن تھا جس کے لیے انھوں نے اپنے آدمیوں کو یہ ہدایت فرمائی کہ تخت کی ہیئت میں فی الجملہ تبدیلی کر دی جائے تاکہ ملکہ صاحبہ کے لیے ان کا اپنا تخت ایک پہیلی بن جائے اور ہم دیکھیں کہ یہ پہیلی بوجھنے میں وہ کامیاب ہوتی ہیں یا ناکام رہ جاتی ہیں!

فَلَمَّا جَاءَتْ قِيلَ أَهَٰكَذَا عَرْشُكِ ۖ قَالَتْ كَأَنَّهُ هُوَ ۚ وَأُوتِينَا الْعِلْمَ مِن قَبْلِهَا وَكُنَّا مُسْلِمِينَ (۴۲)

ملکۂ سبا حضرت سلیمانؑ کے دربار میں

ملکہ نے تحائف کے ساتھ جو وفد حضرت سلیمانؑ کی خدمت میں بھیجا تھا اس کی ناکام واپسی کے بعد ملکہ نے حضرت سلیمانؑ سے براہ راست ملاقات کا ارادہ فرمایا۔ تورات سے معلوم ہوتا ہے اور قرآن سے بھی، جیسا کہ آگے کی آیات سے واضح ہوگا، اس کی تائید ہوتی ہے کہ ملکہ حضرت سلیمانؑ کی حکمت سے بہت متاثر تھیں۔ اس صورتِ حال کے پیدا ہو جانے کے بعد انھوں نے چاہا کہ وہ براہِ راست حضرت سلیمانؑ سے گفتگو کر کے ان کے علم و حکمت سے بھی مستفید ہوں اور اپنے سیاسی مسئلہ کا بھی کوئی حل تلاش کریں چنانچہ وہ اپنے بہت سے وزراء و اعیان کے ساتھ حضرت سلیمانؑ سے ملاقات کے لیے آئیں۔ یہاں ان کے سامنے وہ پہیلی رکھی گئی جس کا ذکر اوپر ہوا۔ ان کا تخت دکھا کر ان سے سوال کیا گیا کہ آپ کا تخت ایسا ہی ہے یا اس سے کچھ مختلف؟ ملکہ یہ منظر دیکھ کر بالکل ہک دک رہ گئیں! بڑی احتیاط کے ساتھ بولیں کہ یہ تو گویا وہی ہے! اس کے ساتھ انھوں نے صاف لفظوں میں یہ اعتراف کر لیا کہ حضرت سلیمانؑ کی عظمت و شوکت کا علم اس سے پہلے بھی ہمیں تھا اور ہم قلبی طور پر ان کے مطیع و منقاد رہے ہیں۔ 'مِن قَبْلِهَا' میں ضمیر کا مرجع یہ واقعہ یا معجزہ ہے جو ملکہ کے مشاہدہ میں آیا۔ ملکہ کے اس قول سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت سلیمانؑ کے کارناموں اور ان کے علم و حکمت سے تنہا وہی متاثر نہیں تھیں بلکہ ان کے دوسرے بہت سے وزراء و امراء بھی متاثر تھے۔ اور یہ بات بالکل قرینِ قیاس ہے۔ آخر ملکہ کے تاثرات سے ان کے دوسرے مقربین متاثر کیوں نہ ہوتے؟ ممکن بلکہ اغلب ہے کہ اس موقع پر وہی مقربین ملکہ کے ساتھ رہے ہوں۔

وَصَدَّهَا مَا كَانَت تَّعْبُدُ مِن دُونِ اللَّهِ ۖ إِنَّهَا كَانَتْ مِن قَوْمٍ كَافِرِينَ (۴۳)

ماحول کے اثرات

یہ قرآن نے توجیہ بیان کی ہے اس بات کی کہ حضرت سلیمانؑ کے علم و حکمت سے اس قدر متاثر اور قلبی طور پر ان کی مطیع و منقاد ہونے کے باوجود آخر ملکہ اتنے عرصے تک ایک غلط دین پر کیوں جمی رہ گئیں؟ فرمایا کہ اس کا سبب ان کے وہ اصنام تھے جن کو وہ پوجتی رہی تھیں اور ان کی وہ کافر قوم جس کی وہ ایک فرد تھیں۔ مطلب یہ ہے کہ روایات اور قومی روابط کی زنجیریں ہر شخص آسانی سے نہیں توڑ سکتا۔ کتنے لوگ ایسے ہوتے ہیں جن پر حق واضح ہوتا ہے لیکن وہ اپنے ماحول کے بندھنوں میں ایسے بندھے ہوئے ہوتے ہیں کہ ان سے رہائی حاصل کرنے کی جرأت نہیں کر سکتے۔ صرف صاحبِ توفیق ہی ہوتے ہیں جو راہ کے ان بھاری پتھروں کو ہٹانے میں کامیاب ہوتے ہیں۔ یہ مشکل یوں تو ہر ایک کی راہ میں ہوتی ہے لیکن جن لوگوں کو سیادت و قیادت کا منصب حاصل ہوتا ہے ان کے لیے یہ مشکل دو چند بلکہ دہ چند ہو جاتی ہے۔ وہ اپنے ماحول کے بالکل ہی غلام بن کر رہ جاتے ہیں۔ مدعی تو وہ ہوتے ہیں لوگوں کے لیڈر ہونے کے لیکن چلتے ہیں لوگوں کے پیچھے پیچھے۔

قِيْلَ لَهَا ادْخُلِي الصَّرْحَ ۚ فَلَمَّا رَاَتْهُ حَسِبَتْهُ لُجَّةً وَّكَشَفَتْ عَنْ سَاقَيْهَا ۚ قَالَ اِنَّهٗ صَرْحٌ مُّمَرَّدٌ مِّنْ قَوَارِيْرَ ۗ قَالَتْ رَبِّ اِنِّيْ ظَلَمْتُ نَفْسِيْ وَاَسْلَمْتُ مَعَ سُلَيْمٰنَ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ (۴۴)

حضرت سلیمانؑ کے شیش محل کے اندر ملکۂ سبا کی حیرانی

اس کے بعد حضرت سلیمانؑ کے خدام کی طرف سے ملکہ سے یہ درخواست کی گئی کہ وہ محل کے اندر تشریف لے چلیں۔ ملکہ محل کے اندر داخل ہوئیں تو ان کی نگاہیں خیرہ ہو کر رہ گئیں۔ انھوں نے فرش پر قدم رکھا تو انھیں ایسا محسوس ہوا کہ وہ کسی گہرے پانی کے حوض میں اتر رہی ہیں اور جس طرح ایک پانی میں اترنے والا اپنے پائنچے چڑھا لیتا ہے بالکل بے ساختہ، غیر ارادی طور پر، انھوں نے بھی اپنے پائنچے چڑھا لیے۔ اس وقت حضرت سلیمان علیہ السلام نے ان کو بتایا کہ یہ پانی کا حوض نہیں بلکہ یہ محل اور اس کا یہ فرش شیشہ سے بنایا گیا ہے۔

مقصود اس بیان سے یہ دکھانا ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے تعمیری کمال کا یہ حال تھا کہ ان کے شیش محل میں پہنچ کر ملکۂ سبا جیسی صاحبِ تاج و اورنگ بھی فرش کو حوض سمجھیں اور بے ساختہ ان سے ایسی حرکت صادر ہو گئی جس سے ثابت ہو گیا کہ یہ منظر ان کو زندگی میں بالکل پہلی مرتبہ دیکھنے کا اتفاق ہوا۔

معلوم ہوتا ہے محل کا فرش شیشہ کی دبیز تختیوں سے بنایا گیا تھا اور اس کے نیچے پانی بہہ رہا تھا اس وجہ سے کوئی انجان جب فرش پر قدم رکھتا تو اس کو ایسا محسوس ہوتا کہ گویا وہ کسی حوض میں اتر رہا ہے۔ ایک دیہاتی جب کسی متمدن شہر کے ایوانوں اور محلوں میں داخل ہوتا ہے تو اس کو اس طرح کی حیرانی بہت پیش آتی ہے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کے محل کا حال یہ تھا کہ اس کے اندر دیہاتی تو درکنار ملکہ سبا بھی ایک دیہاتی بن گئیں۔

ملکۂ سبا کا اعتراف و اعلان

قَالَتْ رَبِّ اِنِّيْ ظَلَمْتُ نَفْسِيْ وَاَسْلَمْتُ مَعَ سُلَيْمٰنَ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ۔ ایک طرف حضرت سلیمانؑ

کی حکمت و معرفت اور دوسری طرف یہ شان و شکوہ، ان دونوں چیزوں نے مل کر ملکہ کو اتنا متاثر کیا کہ وہ بے تحاشا پکار اٹھیں کہ اے رب! میں نے اپنی جان پر بڑا ظلم ڈھایا کہ اب تک شرک و بت پرستی میں گرفتار اور قومی رسوم و روایات کی پرستار بنی رہی۔ اب میں اپنے آپ کو سلیمانؑ کے ساتھ خداوندِ عالم کے حوالہ کرتی ہوں۔ ملکہ نے یہ اعلان کر کے اپنے آپ کو اللہ رب العٰلمین کی اور اپنی حکومت کو حضرت سلیمانؑ کی ماتحتی میں دے دیا۔

اس سے معلوم ہوا کہ وہ شیش محل بھی اللہ کی ایک نشانی ہے جس کے ساتھ عبدیت و انابت اور شکر گزاری و وفاداری کا وہ جمال ہو جو حضرت سلیمانؑ کے اندر تھا۔ اس سے خلق کو رہنمائی ملتی ہے اور وہ آنکھوں کو خیرہ کرنے کے بجائے ان کو بصیرت بخشتا ہے۔ اگر یہ چیز نہ ہو تو پھر وہ کبر و غرور کا ایک نشان اور ایک ظلمت خانہ ہے اگرچہ کوئی اس کا نام قصرِ ابیض (WHITE HOUSE) ہی کیوں نہ رکھ چھوڑے۔

عبدیت کا جمال اور شکوہ خسروی کا

حضرت سلیمانؑ کے اس شیش محل سے متعلق یہ بات بھی یاد رکھیے کہ یہ نہ دوسروں کی مدد اور ان کے قرض سے بنا تھا اور نہ اپنے ملک کے لوگوں کو بھوکوں مار کے بنا تھا۔ بلکہ یہ اس وقت بنا جب حضرت سلیمانؑ کی قوم کی رفاہیت کا یہ حال تھا کہ تورات میں آتا ہے کہ ملک کے اندر سونے کی اتنی کثرت تھی کہ چاندی کی وہاں کوئی قیمت ہی باقی نہیں رہ گئی تھی۔ علاوہ ازیں خود قرآن سے، سورۂ سبا کی تفسیر میں ان شاء اللہ واضح ہو جائے گا کہ حضرت سلیمانؑ نے صرف ایوان و محل ہی نہیں تعمیر کیے تھے بلکہ ان ایوانوں کے پہلو بہ پہلو عظیم لنگر خانے بھی قائم کیے تھے جہاں سے ضرورت مندوں کو پیٹ بھر کر روٹی ملتی تھی۔ بہرحال تعمیر و تمدن بجائے خود کوئی بری چیز نہیں ہے۔ جس طرح عبدیت کے جمال کے ساتھ خسروی شکوہ میں کوئی خرابی نہیں ہے اسی طرح خلق کی رفاہیت کے ساتھ تعمیرات کے شکوہ میں بھی کوئی خرابی نہیں ہے۔ خرابی درحقیقت عدمِ توازن میں ہے اور اس عدمِ توازن سے اپنے آپ کو محفوظ رکھنا بڑے ہی صاحبِ توفیق لوگوں کا کام ہے۔

ملکۂ سبا کا ذکر تورات میں

ملکہ سبا کی یہ سرگزشت تورات میں اس تفصیل و وضاحت سے نہیں آئی ہے لیکن اس کے بھی ضروری حصے پر نظر ڈال لیجیے تاکہ قرآن مجید اور تورات میں جو قدر مشترک ہے وہ سامنے آجائے۔ تورات میں ملکہ کی آمد اور ان کے تاثرات کا یوں ذکر ہوا ہے۔

> اور جب سبا کی ملکہ نے خداوند کے نام کی بابت سلیمان کی شہرت سنی تو وہ آئی ......... اور وہ بہت بڑی جلو کے ساتھ یروشلم میں آئی اور اس کے ساتھ اونٹ تھے جن پر مصالح اور بہت سا سونا اور بیش بہا جواہر لدے تھے اور جب وہ سلیمان کے پاس پہنچی تو اس نے ان سب باتوں کے بارہ میں جو اس کے دل میں تھیں اس سے گفتگو کی ......... اور جب سبا کی ملکہ نے سلیمان کی ساری حکمت اور اس محل کو جو اس نے بنایا تھا اور اس کے دستر خوان کی نعمتوں اور اس کے ملازموں کی نشست اور اس کے خادموں کی حاضر باشی اور ان کی پوشاک اور اس کے ساقیوں اور اس سیڑھی کو جس سے وہ خداوند کے گھر کو جاتا تھا، دیکھا تو اس کے ہوش اڑ گئے ـــــ اور اس نے بادشاہ سے کہا کہ وہ سچی خبر تھی جو میں نے تیرے

کاموں اور تیری حکمت کی بابت اپنے ملک میں سنی تھی۔ تو بھی میں نے وہ باتیں باور نہ کیں جب تک خود آ کر اپنی آنکھوں سے یہ دیکھ نہ لیا اور مجھے تو آدھا بھی نہیں بتایا گیا تھا کیونکہ تیری حکمت اور اقبال مندی اس شہرت سے جو میں نے سنی بہت زیادہ ہے۔ خوش نصیب ہیں تیرے لوگ اور خوش نصیب ہیں تیرے یہ ملازم ......... اور سلیمان بادشاہ نے سبا کی ملکہ کو سب کچھ جس کی وہ مشتاق ہوئی اور جو کچھ اس نے مانگا دیا۔ علاوہ ازیں سلیمان نے اس کو اپنی شاہانہ سخاوت سے بھی عنایت کیا۔ پھر وہ اپنے ملازموں سمیت اپنی مملکت کو لوٹ گئی۔" (۱۔سلاطین: باب ۱۰-۱۳)

تورات کا یہ بیان اگرچہ ادھورا ہے لیکن قدر مشترک اس میں بھی موجود ہے۔

تورات کے اس بیان سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اس کے بعد ملکہ اپنی مملکت کو واپس چلی گئیں۔ ہمارے نزدیک یہ بات بالکل قرین قیاس ہے اور قرآن میں کوئی چیز اس کے خلاف نہیں جاتی۔ جب ملکہ نے سیاست اور مذہب دونوں میں حضرت سلیمانؑ کی اطاعت کر لی اور ان کے بہت سے وزراء و اعیان بھی ملکہ کے ہم خیال تھے اور وہ اپنی مملکت کی بلا شرکت غیرے بادشاہ اور اپنی رعایا میں مقبول تھیں تو دین اور سیاست دونوں کے نقطۂ نظر سے یہی بات صحیح تھی کہ وہ اپنے ملک میں جا کر اپنی حکومت ان اصولوں کے مطابق چلائیں جو حضرت سلیمانؑ نے ان کو بتائے۔ بعض تفسیری روایات میں یہ جو آیا ہے کہ حضرت سلیمانؑ نے ان سے نکاح کر کے ان کو اپنے حرم میں داخل کر لیا، یہ بات کچھ صحیح نہیں معلوم ہوتی۔ سند کے اعتبار سے بھی یہ روایات ضعیف ہیں۔

## ۶۔ آگے کا مضمون ــــ آیات ۴۵-۵۸

اوپر فرعون کے تمرّد، حضرت سلیمانؑ کی شکر گزاری اور ملکۂ سبا کی سلامت روی کی سرگزشتیں سنائی گئی ہیں اور یہ دکھایا گیا ہے کہ علو و استکبار کا انجام کیا ہوتا ہے اور شکر گزاری و فروتنی کا صلہ کیا ملتا ہے۔ اب خاص عرب کی اقوام بائدہ میں سے دو قوموں ــــ قوم ثمود و قوم لوط ــــ کے افساد اور ان کے انجام کا حوالہ دیا تاکہ قریش یہ نہ سمجھیں کہ یہ دور کے ملکوں ــــ مصر، فلسطین اور یمن ــــ کے واقعات ہیں۔ بلکہ خود اپنے ملک کے اندر کی ان قوموں کے انجام سے بھی سبق لیں جن کے علو و استکبار کے نتائج کی داستان سنانے کے لیے ان کے عالی شان تعمیرات کے کھنڈر آج بھی ان کے سامنے موجود ہیں۔ آیات کی تلاوت فرمائیے:

آیات ۴۵-۵۸

وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا إِلَىٰ ثَمُودَ أَخَاهُمْ صَالِحًا أَنِ اعْبُدُوا اللَّهَ فَإِذَا هُمْ فَرِيقَانِ يَخْتَصِمُونَ ﴿٤٥﴾ قَالَ يَا قَوْمِ لِمَ تَسْتَعْجِلُونَ بِالسَّيِّئَةِ

قَبْلَ الْحَسَنَةِ ۚ لَوْلَا تَسْتَغْفِرُوْنَ اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ﴿٤٦﴾ قَالُوا
اطَّيَّرْنَا بِكَ وَبِمَنْ مَّعَكَ ۚ قَالَ طٰٓئِرُكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ
تُفْتَنُوْنَ ﴿٤٧﴾ وَكَانَ فِي الْمَدِيْنَةِ تِسْعَةُ رَهْطٍ يُّفْسِدُوْنَ فِي
الْاَرْضِ وَلَا يُصْلِحُوْنَ ﴿٤٨﴾ قَالُوْا تَقَاسَمُوْا بِاللّٰهِ لَنُبَيِّتَنَّهٗ وَاَهْلَهٗ
ثُمَّ لَنَقُوْلَنَّ لِوَلِيِّهٖ مَا شَهِدْنَا مَهْلِكَ اَهْلِهٖ وَاِنَّا لَصٰدِقُوْنَ ﴿٤٩﴾
وَمَكَرُوْا مَكْرًا وَّمَكَرْنَا مَكْرًا وَّهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ﴿٥٠﴾ فَانْظُرْ كَيْفَ
كَانَ عَاقِبَةُ مَكْرِهِمْ ۙ اَنَّا دَمَّرْنٰهُمْ وَقَوْمَهُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿٥١﴾
فَتِلْكَ بُيُوْتُهُمْ خَاوِيَةًۢ بِمَا ظَلَمُوْا ۗ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ
يَّعْلَمُوْنَ ﴿٥٢﴾ وَاَنْجَيْنَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَكَانُوْا يَتَّقُوْنَ ﴿٥٣﴾ وَلُوْطًا
اِذْ قَالَ لِقَوْمِهٖٓ اَتَاْتُوْنَ الْفَاحِشَةَ وَاَنْتُمْ تُبْصِرُوْنَ ﴿٥٤﴾ اَئِنَّكُمْ
لَتَاْتُوْنَ الرِّجَالَ شَهْوَةً مِّنْ دُوْنِ النِّسَآءِ ۗ بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ
تَجْهَلُوْنَ ﴿٥٥﴾ فَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهٖٓ اِلَّآ اَنْ قَالُوْٓا اَخْرِجُوْٓا
اٰلَ لُوْطٍ مِّنْ قَرْيَتِكُمْ ۚ اِنَّهُمْ اُنَاسٌ يَّتَطَهَّرُوْنَ ﴿٥٦﴾ فَاَنْجَيْنٰهُ
وَاَهْلَهٗٓ اِلَّا امْرَاَتَهٗ ۫ قَدَّرْنٰهَا مِنَ الْغٰبِرِيْنَ ﴿٥٧﴾ وَاَمْطَرْنَا عَلَيْهِمْ
مَّطَرًا ۚ فَسَآءَ مَطَرُ الْمُنْذَرِيْنَ ﴿٥٨﴾ ع

ع ۴ ۱۴ ۱۹

ترجمۂ آیات ۴۵ - ۵۸

اور ہم نے قومِ ثمود کی طرف ان کے بھائی صالح کو اس پیغام کے ساتھ رسول بنا کر
بھیجا کہ لوگو! اللہ کی بندگی کرو۔ تو وہ فریق بن کر آپس میں جھگڑنے لگے۔ اس نے کہا اے
میری قوم کے لوگو، تم بھلائی سے پہلے برائی کے لیے کیوں جلدی مچاتے ہوئے ہو؟ تم

اللہ سے مغفرت کیوں نہیں مانگتے کہ تم پر رحم کیا جائے! ۴۵-۴۶

انھوں نے جواب دیا کہ ہم تو یہ سب تمھاری اور تمھارے ساتھیوں کی نحوست سمجھتے ہیں۔ اس نے کہا، تمھارا نصیبہ اللہ کے پاس ہے بلکہ یہ تو تم آزمائے جا رہے ہو۔ ۴۷

اور شہر میں نو خاندان تھے جو زمین میں فساد برپا کرتے تھے اور اصلاح پر آمادہ نہیں ہوتے تھے۔ انھوں نے اللہ کی قسم کھا کر عہد کیا کہ ہم اس کو اور اس کے لوگوں کو چپکے سے ہلاک کر دیں گے پھر ہم اس کے وارث سے کہہ دیں گے کہ ہم اس کے آدمی کی ہلاکت میں شریک نہیں ہیں اور ہم بالکل سچے ہیں۔ اور انھوں نے بھی چال چلی اور ہم نے بھی تدبیر کی اور وہ باخبر بھی نہ ہوئے۔ تو دیکھو کیسا ہوا ان کی چال کا انجام! ہم نے ان کو اور ان کی پوری قوم کو ہلاک کر دیا۔ پس یہ ہیں ان کے گھر ویران پڑے ہوئے بوجہ اس کے کہ انھوں نے اپنی جانوں پر ظلم ڈھائے! بے شک اس کے اندر بڑا سبق ہے۔ ان لوگوں کے لیے جو جاننا چاہیں۔ اور ہم نے نجات دی ان لوگوں کو جو ایمان لائے اور جو ڈرتے تھے۔ ۴۸-۵۳

اور ہم نے لوط کو بھی رسول بنا کر بھیجا۔ جب اس نے اپنی قوم سے کہا، کیا تم کھلی آنکھوں دیکھتے ہوئے اس بے حیائی کا ارتکاب کرتے ہو! کیا تم لوگ عورتوں کو چھوڑ کر مردوں سے شہوت رانی کرتے ہو! بلکہ تم بڑے ہی جاہل ہو! تو اس کی قوم کا جواب صرف یہ تھا کہ انھوں نے کہا کہ لوط کے ساتھیوں کو اپنی بستی سے نکال دو، یہ لوگ بڑے پارسا بنتے ہیں! تو ہم نے اس کو اور اس کے لوگوں کو نجات دی بجز اس کی بیوی کے، اس کو ہم نے پیچھے رہ جانے والوں میں شمار کر رکھا تھا اور ہم نے ان پر برسایا ایک ہولناک برسانا، پس کیا ہی بری بارش ہوئی ان لوگوں پر جن کو آگاہ کیا جا چکا تھا! ۵۴-۵۸

# ۲-الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَآ اِلٰی ثَمُوْدَ اَخَاهُمْ صٰلِحًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ فَاِذَا هُمْ فَرِیْقٰنِ یَخْتَصِمُوْنَ (۴۵)

حضرت صالحؑ کی دعوت اور اس کا ردِ عمل

یعنی حضرت صالحؑ نے اپنی قوم کو اللہ واحد کی بندگی اور اسی کی اطاعت کی دعوت دی۔ یہ ایک ایسی دعوت تھی جس میں کسی اختلاف و نزاع کی کوئی گنجائش نہیں تھی، اس کا سب کو خیر مقدم کرنا تھا لیکن ہوا یہ کہ کچھ لوگ تو حضرت صالحؑ پر ایمان لائے اور دوسرے بہت سے اشرار و مفسدین اس دعوتِ حق کی مخالفت کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے اور اس طرح قوم دو گروہوں میں بٹ گئی اور دونوں میں بحث و نزاع شروع ہو گیا۔

قَالَ یٰقَوْمِ لِمَ تَسْتَعْجِلُوْنَ بِالسَّیِّئَةِ قَبْلَ الْحَسَنَةِ ۚ لَوْلَا تَسْتَغْفِرُوْنَ اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ (۴۶)

دعوتِ حق کے مخالفین کا عام حربہ، جیسا کہ قرآن میں جگہ جگہ واضح ہو چکا ہے، یہی رہا ہے کہ رسول نے قوم کو جس عذاب سے ڈرایا قوم نے اسی عذاب کا مطالبہ شروع کر دیا کہ اس عذاب کو آنکھوں سے دکھا دو تب ہم مانیں گے کہ تم خدا کے رسول اور اپنی بات میں سچے ہو۔ یہی مطالبہ حضرت صالحؑ کی قوم نے بھی کیا۔ حضرت صالحؑ نے نہایت دردمندی کے ساتھ سمجھایا کہ لوگو! میں تمھیں خدا کی رحمت کی دعوت دے رہا ہوں تو تم اس رحمت سے پہلے خدا کی نقمت کے لیے کیوں جلدی مچا رہے ہو، عذاب کے مطالبہ کے بجائے تم اپنے جرائم کی معافی کیوں نہیں مانگتے کہ خدا کی رحمت کے مستحق بنو! 'سَیِّئَۃٌ' سے مراد، یہاں قرینہ دلیل ہے کہ عذاب اور نقمت ہے اور 'حَسَنَۃٌ' سے استغفار جس کا ثمرہ خدا کی رحمت ہے ۔۔۔ یہ امر ملحوظ رہے کہ اس مرحلے میں بعینہٖ یہی رویہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی قوم نے بھی اختیار کر لیا تھا۔ ان کا مطالبہ بھی یہی تھا کہ اگر اس دعوت کی تکذیب کا انجام ان کی ہلاکت ہے تو اس ہلاکت کی کوئی نشانی ان کو دکھا دی جائے تب وہ مان جائیں گے کہ بے شک قرآن اللہ کی کتاب ہے اور اس کا لانے والا اللہ کا رسول ہے۔ ان لوگوں کو گویا حضرت صالحؑ کی زبان سے یہ جواب دیا گیا ہے کہ تم کو روٹی دی جا رہی ہے تو پتھر نہ مانگو۔ روٹی کی جگہ پتھر مانگنے والوں کا انجام بہت عبرت انگیز ہو چکا ہے اور تمھاری بدبختی ہی ہو گی اگر اس سے سبق نہ حاصل کرو۔

قَالُوا اطَّیَّرْنَا بِكَ وَبِمَنْ مَّعَكَ ۚ قَالَ طٰٓئِرُكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ تُفْتَنُوْنَ (۴۷)

ہم اس سنتِ الٰہی کی وضاحت اعراف ۹۴ کے تحت کر چکے ہیں کہ رسولوں کی بعثت کے زمانے میں ایسی آزمائشوں کا ظہور خاص طور پر ہوا ہے جس سے قوم کے اندر انابت و خشیت پیدا ہو تا کہ لوگوں کے دل رسول کی دعوت کی طرف مائل ہوں اور وہ متنبہ ہوں کہ اگر انھوں نے رسول کی بات نہ مانی تو ان پر وہ فیصلہ کن عذاب آ جائے گا جس کی رسول خبر دے رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ اہتمام دعوتِ حق کے لیے فضا کو

سازگار بنانے کے لیے فرمایا لیکن لوگوں نے اس سے فائدہ اٹھانے کے بجائے یا تو اپنے لیڈروں کے اس مغالطے سے اپنے کو تسلی دے لی کہ اس طرح کے نرم و سخت دن تو قوموں پر آیا ہی کرتے ہیں، ان کو کسی کی تصدیق و تکذیب سے کیا تعلق! یا ان آفتوں کو رسول اور اس کے ساتھیوں کے کھاتے میں ڈال دیا کہ یہ ان کی نحوست کے نتائج ہیں جن سے ہم دوچار ہو رہے ہیں، یہ ہمارے معبودوں اور ہمارے باپ دادا کے دین کے مخالف بن کر اٹھ کھڑے ہوئے ہیں اس وجہ سے ہمارے معبودوں اور بزرگوں کی مار ان پر پڑی ہے اور ان کی لائی ہوئی آفت میں ہم بھی حصہ پا رہے ہیں۔

یہ جو ہم نے عرض کیا ہے اس کے شواہد نقل کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس کتاب میں پیچھے اس پر مفصل بحثیں گزر چکی ہیں۔ یہاں آیت زیر بحث میں اسی بات کی طرف اشارہ ہے کہ جب ہم نے اپنی سنت کے مطابق ان کو مختلف آزمائشوں میں مبتلا کیا تاکہ ان کے دل رسول کی دعوت کی طرف مائل ہوں اور وہ ڈریں کہ اگر وہ اسی طرح تکذیب کی روش پر قائم رہے تو وہ عذابِ الٰہی کی گرفت میں آ جائیں گے تو ان تنبیہات سے متاثر ہونے کے بجائے انھوں نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ یہ تو صالح اور ان کے ساتھیوں کی نحوست ہے کہ ہم ان آفتوں میں مبتلا ہو رہے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ ایسے ہٹ دھرم لوگوں کا کیا علاج! اگر عذاب نہیں آتا تو اس کی نشانی مانگتے ہیں اور اگر نشانی دکھاؤ تو اس کو پیغمبر اور اس کے ساتھیوں کی نحوست پر محمول کرتے ہیں۔

قَالَ طٰٓئِرُكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ تُفْتَنُوْنَ۔ لفظ 'طائر' اور 'تطیر' پر بحث اعراف ۱۳۱ کے تحت گزر چکی ہے۔ یہاں لفظ 'طائر' نصیبہ اور قسمت کے مفہوم میں ہے۔

مطلب یہ ہے کہ یہ آزمائشیں اور آفتیں جو پیش آ رہی ہیں ان کو تم ہماری نحوست کا نتیجہ قرار دے رہے ہو حالانکہ ان سب کا سررشتہ خدا کی تدبیر و تقدیر اور اس کی مشیت و حکمت سے ہے۔ یہ ہماری نحوست کے سبب سے نہیں ظاہر ہو رہی ہیں بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے تمھاری آزمائش ہو رہی ہے۔ ان آزمائشوں میں ڈال کر وہ تمھیں دیکھ رہا ہے کہ تم میں کچھ صلاحیت قبولِ حق کی ہے یا اب تم بالکل ہی مردہ اور دفن کر دیے جانے کے لائق ہو چکے ہو!

وَكَانَ فِي الْمَدِيْنَةِ تِسْعَةُ رَهْطٍ يُّفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ وَلَا يُصْلِحُوْنَ (۴۸)

'رھط' کا مفہوم

'رَهْط' کے معنی قبیلہ اور خاندان کے ہیں۔ سورۂ ہود میں حضرت شعیبؑ کی سرگزشت میں یہ لفظ گزر چکا ہے وَاِنَّا لَنَرٰىكَ فِيْنَا ضَعِيْفًا وَلَوْلَا رَهْطُكَ لَرَجَمْنٰكَ (۹۱) (اور ہم تو تم کو اپنے اندر ایک کمزور آدمی خیال کرتے ہیں اور تمھارے خاندان کا خیال نہ ہوتا تو ہم تم کو سنگسار کر دیتے) استعمالات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ اسی شکل میں جمع اور واحد دونوں کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ اس وجہ سے جن لوگوں نے اس کا ترجمہ شخص کیا ہے ہمارے نزدیک انھوں نے غلط ترجمہ کیا ہے۔

مفسدین کی قوت و جمعیت

اب یہ مفسدین کی قوت و جمعیت کو واضح فرمایا ہے کہ شہر میں نو خاندان تھے جو سب کے سب حضرت صالحؑ

کی دعوت کے مخالف تھے اور حضرت صالحؑ ان کے اندر تیئیں واتوں کے اندر ایک زبان کی حیثیت رکھتے تھے۔ یُفْسِدُوْنَ فِی الْاَرْضِ وَلَا یُصْلِحُوْنَ یعنی یہ تمام خاندان برابر افساد میں سرگرم تھے اور کسی قیمت پر اصلاح قبول کرنے پر آمادہ نہیں ہوتے تھے۔ اصلاح کا واحد راستہ خدا کی بندگی اور اس کی اطاعت میں داخل ہونا ہے اور حضرات انبیاء علیہم السلام نے اسی کی دعوت دی ہے۔ اس وجہ سے اس دعوت کی مخالفت افساد فی الارض ہے۔

قَالُوْا تَقَاسَمُوْا بِاللّٰهِ لَنُبَيِّتَنَّهٗ وَاَهْلَهٗ ثُمَّ لَنَقُوْلَنَّ لِوَلِيِّهٖ مَا شَهِدْنَا مَهْلِكَ اَهْلِهٖ وَاِنَّا لَصٰدِقُوْنَ (۴۹)

حضرت صالحؑ کے خلاف ان کی قوم کے لیڈروں کی سازش

'تَقَاسَمُوْا بِاللّٰهِ' میرے نزدیک یہاں بدل کے محل میں ہے۔ یعنی مذکورہ بالا مفسدین کے تمام خاندانوں نے اللہ کی قسم کے ساتھ آپس میں یہ عہد کیا کہ ہم پوشیدہ طور پر صالحؑ اور ان کے آل و اتباع کو ختم کر دیں گے، پھر ان کے خون کا اگر کوئی مدعی ان کے وارثوں میں سے کھڑا ہوا تو ہم ان سے یہ کہہ دیں گے کہ ان کے آدمی کے قتل میں ہمارا ہاتھ نہیں ہے اور ان کو پوری طرح اطمینان دلا دیں گے کہ ہم بالکل سچے ہیں۔ پوشیدہ طور پر قتل کی یہ سکیم، عہد و پیمان کے ساتھ، اس لیے بنائی گئی کہ یہ لوگ حضرت صالحؑ کو کھلم کھلا قتل کرنے سے ڈرتے تھے کہ اس طرح ان کے خاندان سے ایک مستقل نزاع پیدا ہو جانے کا خطرہ تھا۔ یہ امر ملحوظ رہے کہ قبائلی زندگی میں کسی خاندان کے آدمی کا مارا جانا کوئی آسان معاملہ نہیں ہوتا تھا۔ بلکہ اس سے قاتل اور مقتول کے خاندانوں میں قتل و قصاص کی ایک لامتناہی جنگ چھڑ جاتی تھی۔ اس خطرے سے بچنے کے لیے ان کو کھلم کھلا سنگسار کرنے کے بجائے ان کو اور ان کے اہل کو خفیہ طور پر قتل کرنے کا منصوبہ بنایا گیا اور ساتھ ہی یہ پوشیدہ عہد و پیمان بھی ہوا کہ اس منصوبہ میں سب شریک ہوں تاکہ افشائے راز نہ ہو اور اگر ہو بھی تو حضرت صالحؑ کے ورثا مخالفوں کی بھاری جمعیت سے مرعوب ہو کر کسی انتقامی کارروائی کی جرأت نہ کر سکیں۔ یاد ہوگا، اسی قسم کا منصوبہ قریش کے تمام خاندانوں نے دارالندوہ میں بیٹھ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف بنایا تھا کہ سب مل کر آپؐ کو ایک ساتھ قتل کریں تاکہ آپؐ کا خاندان قصاص کے مطالبہ کی جرأت نہ کر سکے۔ اس مرحلے میں یہ واقعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اسی لیے سنایا گیا ہے کہ تمہارے معاند اشرار بھی اسی قسم کی سازشیں کر رہے ہیں یا کریں گے لیکن جس طرح اللہ نے حضرت صالحؑ اور ان کے ساتھیوں کی حفاظت فرمائی اسی طرح وہ تمہاری اور تمہارے ساتھیوں کی بھی حفاظت فرمائے گا۔

وَمَكَرُوْا مَكْرًا وَّمَكَرْنَا مَكْرًا وَّهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ۝ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ مَكْرِهِمْ ۙ اَنَّا دَمَّرْنٰهُمْ وَقَوْمَهُمْ اَجْمَعِيْنَ (۵۰-۵۱)

مفسدین کی چال کے مقابل میں اللہ تعالیٰ کی تدبیر

ان مفسدین نے جو چال چلی اس کا ذکر اوپر کی آیات میں ہوا۔ اس کے مقابل میں اللہ تعالیٰ نے جو تدبیر اختیار فرمائی اس کا ذکر سورۂ شعراء اور بعض پچھلی سورتوں میں گزر چکا ہے۔ فرمایا کہ دیکھ لو، ان کی چال کا

انجام کیا ہوا! اَنَّا دَمَّرْنٰھُمْ وَقَوْمَھُمْ اَجْمَعِیْنَ' یہ اسی انجام کی وضاحت ہے کہ ہم نے ان مفسدین اوران کی ساری قوم کو پامال کر کے رکھ دیا۔

فَتِلْكَ بُیُوْتُھُمْ خَاوِیَةًۢ بِمَا ظَلَمُوْا ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیَةً لِّقَوْمٍ یَّعْلَمُوْنَ ۝ وَاَنْجَیْنَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَكَانُوْا یَتَّقُوْنَ (۵۲-۵۳)

'تِلْكَ' کا اشارہ یہاں اس بات پر دلیل ہے کہ گویا قریش کو ان کے سامنے کی ایک چیز کی طرف توجہ دلائی جارہی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ کوئی دُور کی داستان نہیں ہے بلکہ ثمود کی شاندار تعمیرات کے کھنڈر اپنی داستانِ عبرت سنانے کے لیے تمھارے ملک میں موجود ہیں۔ یہ امر ملحوظ رہے کہ ثمود، عاد کے بقایا میں سے تھے اس وجہ سے تعمیرات کا ذوق ان کو ورثہ میں ملا تھا اور ان کے تباہ شدہ آثار موجود تھے جن پر سے قریش کے قافلوں کو وقتاً فوقتاً گزرنے کے مواقع ملتے رہتے تھے۔ 'بِمَا ظَلَمُوْا' یعنی بِمَا ظَلَمُوْا اَنْفُسَھُمْ' یہ انجام بد اس وجہ سے ان کو دیکھنا پڑا کہ حضرت صالحؑ کی تکذیب کر کے انھوں نے خود اس کے اسباب پیدا کیے۔

'اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیَةً لِّقَوْمٍ یَّعْلَمُوْنَ' میں فعل ارادۂ فعل کے مفہوم میں ہے یعنی جو لوگ جاننے اور سمجھنے کا ارادہ رکھتے ہوں ان کے لیے اس سرگزشت میں بڑا درسِ عبرت موجود ہے، لیکن جو لوگ کچھ سننا سمجھنا چاہتے ہی نہ ہوں ان کے اوپر کوئی موعظت بھی کارگر نہیں ہو سکتی!

'وَاَنْجَیْنَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَكَانُوْا یَتَّقُوْنَ' یہ ان لوگوں کا ذکر ہے جن کو اللہ نے نجات بخشی۔ ان کی خاص صفت یہ بیان فرمائی ہے کہ یہ خدا اور اس کے عدل و انتقام سے ڈرنے والے تھے۔

وَلُوْطًا اِذْ قَالَ لِقَوْمِهٖۤ اَتَاْتُوْنَ الْفَاحِشَةَ وَاَنْتُمْ تُبْصِرُوْنَ (۵۴)

حضرت لوطؑ اور قوم لوط کا بیان

یہ اوپر والے واقعہ پر معطوف ہے اس وجہ سے یہاں فعل محذوف ہے۔ یعنی 'اَرْسَلْنَا لُوْطًا'۔

'اَلْفَاحِشَةَ' کھلی ہوئی بے حیائی و بے شرمی کو کہتے ہیں جس کے بے حیائی ہونے میں کسی اختلاف و نزاع کی گنجائش نہ ہو۔ اس کی وضاحت آگے آرہی ہے۔

'وَاَنْتُمْ تُبْصِرُوْنَ' یعنی کوئی برائی مخفی قسم کی ہو تو اس میں مبتلا ہو جانا تو چنداں تعجب کی بات نہیں ہے لیکن ایک کھلی ہوئی بے حیائی میں، آنکھیں رکھتے ہوئے مبتلا ہو جانا بدبختی اور اندھے پن کی آخری حد ہے۔ اگر ایک شخص اندھا ہو اور اس کے پاؤں غلاظت پر پڑ جائیں تو اس کے لیے عذر ہے لیکن تمھارے لیے کیا عذر ہے جب کہ تم دونوں آنکھیں رکھتے ہوئے غلاظت کھا رہے ہو!

اَئِنَّكُمْ لَتَاْتُوْنَ الرِّجَالَ شَهْوَةً مِّنْ دُوْنِ النِّسَآءِ ؕ بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ تَجْهَلُوْنَ (۵۵)

استفہام یہاں اظہارِ تعجب و حیرت و کراہت کے لیے ہے۔ 'مِنْ دُوْنِ النِّسَآءِ' کی قید ان کے اندھے پن کو واضح کر رہی ہے کہ تقاضائے شہوت کے لیے ایک فطری اور جائز چیز کے موجود ہوتے تمھارا یہ انحراف تمھاری فطرت کے مسخ ہونے کی دلیل ہے۔ لفظ 'جَھْل' جیسا کہ ہم اس کے محل میں واضح کر چکے ہیں، جذبات و خواہشاتِ نفس،

سے اس طرح مغلوب ہو جانے کے لیے آتا ہے کہ آدمی عقل و ہوش بالکل ہی کھو بیٹھے بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ تَجْهَلُوْنَ۔ یعنی تمھاری عقلیں بالکل ہی ماؤف و مغلوب ہو گئی ہیں۔

فَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهٖٓ اِلَّآ اَنْ قَالُوْٓا اَخْرِجُوْٓا اٰلَ لُوْطٍ مِّنْ قَرْيَتِكُمْ ۚ اِنَّهُمْ اُنَاسٌ يَّتَطَهَّرُوْنَ (۵۶)

حضرت لوطؑ کے خلاف لوگوں کے جذبات بھڑکانے کی کوشش

اس کھلی ہوئی بے حیائی کے حق میں کوئی دلیل تو وہ گھڑ نہیں سکتے تھے لیکن اس کو چھوڑنے کے لیے بھی وہ تیار نہیں تھے اس وجہ سے واحد چارۂ کار ان کے پاس یہی رہ گیا کہ کسی نہ کسی طرح حضرت لوطؑ کی سرزنش سے پیچھا چھڑائیں۔ قوم کے سرغنوں نے اپنے آدمیوں کو ورغلایا کہ لوطؑ اور ان کے ساتھیوں کو اس بستی سے نکال دو۔ 'اِنَّهُمْ اُنَاسٌ يَّتَطَهَّرُوْنَ' (یہ لوگ بڑے پارسا بنتے ہیں) اس فقرے میں جو زہر ہے وہ اہلِ ذوق سے مخفی نہیں ہے۔ حضرت لوطؑ اور ان کے ساتھیوں کے خلاف اپنی قوم کے جذبات بھڑکانے کے لیے انھوں نے یہ کہنا شروع کیا کہ یہ دیکھو ان کے نزدیک ہماری پوری قوم کی قوم تو بدمعاشوں اور گنڈوں کی قوم ہے بس یہی گنتی کے چند نفوس پاک دامن رہ گئے ہیں! جب کوئی برائی وبائے عام کی شکل اختیار کر لے تو اس کے خلاف آواز اٹھانے والوں کو اس طرح کے زہر آلود طعنوں سے بڑی آسانی کے ساتھ نکو بنایا جا سکتا ہے۔ اگر اس میں کسی کو شک ہو تو وہ آج بیگمات کی کسی مجلس میں بے پردگی کے خلاف دو کلمے کہہ کر اس کی تصدیق کر سکتا ہے۔

لفظ 'آل' پر ہم دوسرے محل میں بحث کر کے واضح کر چکے ہیں کہ یہ اہل و عیال اور اتباع سب پر مشتمل ہے۔

فَاَنْجَيْنٰهُ وَاَهْلَهٗٓ اِلَّا امْرَاَتَهٗ ۫ قَدَّرْنٰهَا مِنَ الْغٰبِرِيْنَ (۵۷)

لفظ 'اهل' بھی، جیسا کہ ہم اس کے محل میں وضاحت کر چکے ہیں، اہل و عیال اور اتباع و صحابہ سب کے لیے آتا ہے اور یہاں یہ اسی مفہوم میں ہے۔

اللہ تعالیٰ کے ہاں ذمہ داری بقدرِ انعام ہے

'قَدَّرْنٰهَا مِنَ الْغٰبِرِيْنَ' سے صرف یہی بات نہیں واضح ہوتی کہ حضرت لوطؑ کی بیوی اس نجات سے محروم رہی بلکہ یہ بات بھی اس سے نکلتی ہے کہ اس پتھراؤ کا نشانہ بنانے کے لیے اللہ تعالیٰ نے اس کو خاص طور پر تاک رکھا تھا جو قوم لوط پر ہوا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جب پیغمبر کی بیوی ہو کر بھی اس کی ہمدردیاں اپنی نابکار قوم کے ساتھ ہی رہیں تو دوسروں کے مقابل میں خدا کے غضب کی وہ زیادہ مستحق تھی۔ اللہ تعالیٰ جن کو تعلیم و ہدایت کے جتنے ہی زیادہ مواقع میسر فرماتا ہے، اگر وہ اس کی قدر نہیں کرتے تو ان کو سزا بھی اسی کے حساب سے ملتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کے ہاں ذمہ داری بقدرِ انعام ہے۔

وَاَمْطَرْنَا عَلَيْهِمْ مَّطَرًا ۚ فَسَآءَ مَطَرُ الْمُنْذَرِيْنَ (۵۸)

قوم لوط کا انجام

یعنی لوطؑ اور ان کے ساتھیوں کو تو اللہ تعالیٰ نے نجات بخشی اور بقیہ پوری قوم پر، فرمایا کہ، ہم نے ایک نہایت بری بارش برسائی۔ اس بارش سے مراد اس پتھراؤ کی بارش ہے جس کی تفصیل پچھلے کی سورتوں میں گزر

چکی ہے۔ 'فَسَآءَ مَطَرُ الْمُنْذَرِيْنَ' میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ یہ بری بارش نتیجہ تھی اس بات کا کہ ان لوگوں پر اللہ نے اپنے ایک رسول کے ذریعہ سے اتمامِ حجت فرما دیا تھا۔ اس اتمامِ حجت کے بعد بھی جب وہ اندھے بہرے ہی بنے رہے تو مستحق ٹھہرے کہ وہ سنگسار کر کے زمین میں دفن کر دیے جائیں۔

یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ قوم ثمود کی طرح قوم لوط کی بستیاں بھی قریش کی گزرگاہ تھیں۔ اسی وجہ سے ان دونوں قوموں کا خاص طور پر اس سورہ میں ذکر فرمایا کہ دور اور قریب دونوں کے آثار کی طرف ان کو توجہ دلا دی جائے۔

## ۸۔ آگے کا مضمون ——— آیات ۵۹-۹۳

خاتمۂ سورہ

آگے خاتمۂ سورہ کی آیات ہیں جن میں اوپر بیان کیے ہوئے واقعات کے نتائج سامنے رکھ دیے گئے ہیں خاص طور پر قرآن کی دعوتِ توحید پورے زور کے ساتھ اس کے آفاقی و انفسی دلائل کے ساتھ پیش کی گئی ہے۔ نیز منکرین کے اصل سببِ انکار سے پردہ اٹھایا گیا ہے کہ ان کی ساری سخن سازیوں کے پس پردہ یہ چیز ہے کہ یہ آخرت کے بارے میں متردد ہیں حالانکہ وہ ایک حقیقت ہے۔ آفاق و انفس کے دلائل پکار پکار کر اس کی شہادت دے رہے ہیں۔ یہی بات، یاد ہوگا، تمہید کی آیات میں بھی فرمائی گئی ہے۔ اس طرح خاتمۂ سورہ کا مضمون تمہید کے ساتھ مربوط ہو گیا ہے۔

مطالب کے بیچ بیچ میں بھی اور سورہ کے آخر میں خاص طور پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی گئی ہے کہ یہ لوگ قرآن کے انکار اور تمہاری تکذیب کے لیے جو مطالبات و اعتراضات پیش کر رہے ہیں تم ان کی پروا نہ کرو۔ تمہارا کام اندھوں اور بہروں کو دکھانا اور سنانا نہیں ہے۔ تم ان کو صاف بتا دو کہ میرے اوپر اس قرآن کو پہنچا دینے کی ذمہ داری ہے اس کو ماننا اور نہ ماننا تمہارا کام ہے۔ اگر یہ اس کو نہیں مانیں گے تو قرآن جن باتوں سے ان کو آگاہ کر رہا ہے ان میں سے ایک ایک چیز ان کے سامنے آ کے رہے گی۔ آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۵۹-۹۳
الجزء ۲۰

قُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ وَسَلٰمٌ عَلٰى عِبَادِهِ الَّذِيْنَ اصْطَفٰى ۭ آٰللّٰهُ خَيْرٌ اَمَّا يُشْرِكُوْنَ ﴿۵۹﴾ اَمَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَاَنْزَلَ لَكُمْ مِّنَ السَّمَاۗءِ مَاۗءً ۚ فَاَنْۢبَتْنَا بِهٖ حَدَاۗىِٕقَ ذَاتَ بَهْجَةٍ ۚ مَا كَانَ لَكُمْ اَنْ تُنْۢبِتُوْا شَجَرَهَا ۭ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ۭ بَلْ هُمْ قَوْمٌ يَّعْدِلُوْنَ ﴿۶۰﴾ اَمَّنْ جَعَلَ الْاَرْضَ قَرَارًا وَّجَعَلَ خِلٰلَهَآ اَنْهٰرًا وَّجَعَلَ لَهَا رَوَاسِيَ وَجَعَلَ بَيْنَ الْبَحْرَيْنِ حَاجِزًا ۭ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ۭ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا

يَعْلَمُونَ ﴿٦١﴾ أَمَّنْ يُجِيبُ الْمُضْطَرَّ إِذَا دَعَاهُ وَيَكْشِفُ السُّوءَ وَيَجْعَلُكُمْ
خُلَفَاءَ الْأَرْضِ ۗ أَإِلَٰهٌ مَعَ اللَّهِ ۚ قَلِيلًا مَا تَذَكَّرُونَ ﴿٦٢﴾ أَمَّنْ
يَهْدِيكُمْ فِي ظُلُمَاتِ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَمَنْ يُرْسِلُ الرِّيَاحَ بُشْرًا بَيْنَ
يَدَيْ رَحْمَتِهِ ۗ أَإِلَٰهٌ مَعَ اللَّهِ ۚ تَعَالَى اللَّهُ عَمَّا يُشْرِكُونَ ﴿٦٣﴾ أَمَّنْ
يَبْدَأُ الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيدُهُ وَمَنْ يَرْزُقُكُمْ مِنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ ۗ
أَإِلَٰهٌ مَعَ اللَّهِ ۚ قُلْ هَاتُوا بُرْهَانَكُمْ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ ﴿٦٤﴾ قُلْ
لَا يَعْلَمُ مَنْ فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ الْغَيْبَ إِلَّا اللَّهُ ۚ وَمَا يَشْعُرُونَ
أَيَّانَ يُبْعَثُونَ ﴿٦٥﴾ بَلِ ادَّارَكَ عِلْمُهُمْ فِي الْآخِرَةِ ۚ بَلْ هُمْ فِي شَكٍّ
مِنْهَا ۖ بَلْ هُمْ مِنْهَا عَمُونَ ﴿٦٦﴾ وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا أَإِذَا كُنَّا تُرَابًا ع
وَآبَاؤُنَا أَئِنَّا لَمُخْرَجُونَ ﴿٦٧﴾ لَقَدْ وُعِدْنَا هَٰذَا نَحْنُ وَآبَاؤُنَا
مِنْ قَبْلُ إِنْ هَٰذَا إِلَّا أَسَاطِيرُ الْأَوَّلِينَ ﴿٦٨﴾ قُلْ سِيرُوا فِي الْأَرْضِ
فَانْظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُجْرِمِينَ ﴿٦٩﴾ وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ
وَلَا تَكُنْ فِي ضَيْقٍ مِمَّا يَمْكُرُونَ ﴿٧٠﴾ وَيَقُولُونَ مَتَىٰ هَٰذَا الْوَعْدُ
إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ ﴿٧١﴾ قُلْ عَسَىٰ أَنْ يَكُونَ رَدِفَ لَكُمْ بَعْضُ الَّذِي
تَسْتَعْجِلُونَ ﴿٧٢﴾ وَإِنَّ رَبَّكَ لَذُو فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَهُمْ
لَا يَشْكُرُونَ ﴿٧٣﴾ وَإِنَّ رَبَّكَ لَيَعْلَمُ مَا تُكِنُّ صُدُورُهُمْ وَمَا
يُعْلِنُونَ ﴿٧٤﴾ وَمَا مِنْ غَائِبَةٍ فِي السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ إِلَّا فِي كِتَابٍ
مُبِينٍ ﴿٧٥﴾ إِنَّ هَٰذَا الْقُرْآنَ يَقُصُّ عَلَىٰ بَنِي إِسْرَائِيلَ أَكْثَرَ الَّذِي

هُمْ فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ﴿٧٦﴾ وَاِنَّهٗ لَهُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ﴿٧٧﴾ اِنَّ رَبَّكَ
يَقْضِيْ بَيْنَهُمْ بِحُكْمِهٖ ۚ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْعَلِيْمُ ﴿٧٨﴾ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ۭ اِنَّكَ
عَلَى الْحَقِّ الْمُبِيْنِ ﴿٧٩﴾ اِنَّكَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتٰى وَلَا تُسْمِعُ الصُّمَّ الدُّعَاۗءَ
اِذَا وَلَّوْا مُدْبِرِيْنَ ﴿٨٠﴾ وَمَآ اَنْتَ بِهٰدِي الْعُمْيِ عَنْ ضَلٰلَتِهِمْ ۭ اِنْ
تُسْمِعُ اِلَّا مَنْ يُّؤْمِنُ بِاٰيٰتِنَا فَهُمْ مُّسْلِمُوْنَ ﴿٨١﴾ وَاِذَا وَقَعَ الْقَوْلُ عَلَيْهِمْ
اَخْرَجْنَا لَهُمْ دَاۗبَّةً مِّنَ الْاَرْضِ تُكَلِّمُهُمْ ۙ اَنَّ النَّاسَ كَانُوْا بِاٰيٰتِنَا
لَا يُوْقِنُوْنَ ﴿٨٢﴾ ۧ وَيَوْمَ نَحْشُرُ مِنْ كُلِّ اُمَّةٍ فَوْجًا مِّمَّنْ يُّكَذِّبُ بِاٰيٰتِنَا
فَهُمْ يُوْزَعُوْنَ ﴿٨٣﴾ حَتّٰٓى اِذَا جَاۗءُوْ قَالَ اَكَذَّبْتُمْ بِاٰيٰتِيْ وَلَمْ
تُحِيْطُوْا بِهَا عِلْمًا اَمَّاذَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿٨٤﴾ وَوَقَعَ الْقَوْلُ عَلَيْهِمْ
بِمَا ظَلَمُوْا فَهُمْ لَا يَنْطِقُوْنَ ﴿٨٥﴾ اَلَمْ يَرَوْا اَنَّا جَعَلْنَا الَّيْلَ لِيَسْكُنُوْا
فِيْهِ وَالنَّهَارَ مُبْصِرًا ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ﴿٨٦﴾ وَيَوْمَ
يُنْفَخُ فِي الصُّوْرِ فَفَزِعَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ اِلَّا مَنْ
شَاۗءَ اللّٰهُ ۭ وَكُلٌّ اَتَوْهُ دٰخِرِيْنَ ﴿٨٧﴾ وَتَرَى الْجِبَالَ تَحْسَبُهَا جَامِدَةً
وَّهِيَ تَمُرُّ مَرَّ السَّحَابِ ۭ صُنْعَ اللّٰهِ الَّذِيْٓ اَتْقَنَ كُلَّ شَيْءٍ ۭ اِنَّهٗ خَبِيْرٌۢ
بِمَا تَفْعَلُوْنَ ﴿٨٨﴾ مَنْ جَاۗءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ خَيْرٌ مِّنْهَا ۚ وَهُمْ مِّنْ فَزَعٍ
يَّوْمَىِٕذٍ اٰمِنُوْنَ ﴿٨٩﴾ وَمَنْ جَاۗءَ بِالسَّيِّئَةِ فَكُبَّتْ وُجُوْهُهُمْ فِي النَّارِ ۭ
هَلْ تُجْزَوْنَ اِلَّا مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿٩٠﴾ اِنَّمَآ اُمِرْتُ اَنْ اَعْبُدَ رَبَّ
هٰذِهِ الْبَلْدَةِ الَّذِيْ حَرَّمَهَا وَلَهٗ كُلُّ شَيْءٍ ۡ وَّاُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ

مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ ﴿۹۱﴾ وَاَنْ اَتْلُوَا الْقُرْاٰنَ ۚ فَمَنِ اهْتَدٰى فَاِنَّمَا يَهْتَدِيْ لِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ ضَلَّ فَقُلْ اِنَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُنْذِرِيْنَ ﴿۹۲﴾ وَقُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ سَيُرِيْكُمْ اٰيٰتِهٖ فَتَعْرِفُوْنَهَا ۭ وَمَا رَبُّكَ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۹۳﴾ ع ۱۱/۳

ترجمہ آیات ۵۹-۹۳

کہہ دو کہ شکر کا سزاوار اللہ ہے اور اس کے ان بندوں پر سلامتی و رحمت ہے جن کو اس نے برگزیدہ کیا۔ کیا اللہ بہتر ہے یا وہ چیزیں جن کو یہ شریک ٹھہراتے ہیں! ۵۹

(کیا تمھارے یہ معبود بہتر ہیں) یا وہ جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اور تمھارے لیے جس نے آسمان سے پانی اتارا۔ پس ہم نے اس پانی سے خوش منظر باغ اگائے۔ تمھارے امکان میں نہ تھا کہ تم ان کے درختوں کو اُگا سکتے؟ کیا اللہ کے ساتھ کوئی اور معبود بھی ہے؟ بلکہ یہ راہِ حق سے انحراف اختیار کرنے والے لوگ ہیں! ۶۰

(کیا تمھارے یہ اصنام سزاوارِ شکر ہیں) یا وہ جس نے زمین کو ٹھکانا بنایا اور جس نے اس کے درمیان نہریں جاری کیں اور اس کے لیے اس نے پہاڑ بنائے اور دو سمندروں کے درمیان جس نے پردہ ڈال دیا؟ کیا اللہ کے ساتھ کوئی اور معبود بھی ہے! بلکہ ان کے اکثر لوگ نہیں جانتے! ۶۱

(کیا تمھارے یہ شرکا مستحقِ عبادت ہیں) یا وہ جو محتاج کی دادرسی کرتا ہے جب کہ وہ اس کو پکارتا ہے اور اس کے دکھ کو دور کرتا ہے اور تم کو زمین کی وراثت دیتا ہے؟ کیا اللہ کے سوا کوئی اور معبود بھی ہے! بہت ہی کم تم لوگ یاددہانی حاصل کرتے ہو! ۶۲

(کیا تمھارے یہ دیوی دیوتا لائقِ پرستش ہیں) یا وہ جو بحر و بر کی تاریکیوں میں تمھاری رہنمائی کرتا ہے اور جو ہواؤں کو اپنے بارانِ رحمت سے پہلے خوشخبری بنا کر بھیجتا ہے؟ کیا اللہ

کے ساتھ کوئی اور معبود بھی ہیں؟ اللہ بہت ہی برتر ہے ان چیزوں سے جن کو یہ اس کا شریک ٹھہراتے ہیں! ۶۳

(کیا تمہارے مزعومہ شفعاء لائق بندگی ہیں) یا وہ جو خلق کا آغاز کرتا ہے پھر اس کا اعادہ کرے گا اور جو تم کو آسمان اور زمین سے روزی دیتا ہے؟ کیا اللہ کے ساتھ کوئی اور معبود بھی ہے! کہو کہ تم اپنی دلیل لاؤ، اگر تم سچے ہو! ۶۴

کہہ دو کہ آسمانوں اور زمین میں جو بھی ہیں، اللہ کے سوا کسی کو بھی غیب کا علم نہیں ہے اور انھیں پتہ بھی نہیں کہ وہ کب اٹھائے جائیں گے۔ ۶۵

بلکہ آخرت کے باب میں ان کا علم الجھا ہوا ہے۔ بلکہ یہ لوگ اس کے بارے میں مبتلائے شک ہیں، بلکہ یہ لوگ اس سے اندھے بنے ہوئے ہیں۔ اور یہ کافر کہتے ہیں کہ کیا جب ہم مٹی ہو جائیں گے اور ہمارے آباؤ اجداد بھی تو کیا ہم دوبارہ نکالے جائیں گے! اس کی دھمکی ہمیں بھی دی گئی اور اس سے پہلے ہمارے آباؤ اجداد کو بھی۔ یہ محض اگلوں کے فسانے ہیں۔ ۶۶-۶۸

ان سے کہو کہ زمین میں چلو پھرو اور دیکھو کہ مجرموں کا انجام کیا ہوا۔ ۶۹

اور ان کے حال پر غم نہ کرو اور نہ ان کی چالوں سے جو وہ چل رہے ہیں فکر مند ہو۔ اور یہ پوچھتے ہیں کہ یہ دھمکی کب ظہور میں آئے گی اگر تم سچے ہو! کہہ دو کہ بہت ممکن ہے کہ جس چیز کے لیے تم جلدی مچائے ہوئے ہو اس کا کوئی حصہ تمہارے پیچھے ہی لگا ہوا ہو۔ اور بے شک تمہارا رب لوگوں پر بڑے فضل والا ہے لیکن ان میں کے اکثر شکرگزار نہیں ہوتے۔ اور تمہارا رب خوب جانتا ہے جو ان کے سینے چھپائے ہوئے ہیں اور جو کچھ وہ ظاہر کرتے ہیں۔ اور آسمان و زمین میں کوئی ایسی مخفی چیز نہیں ہے جو ایک واضح رجسٹر میں درج نہ ہو۔ ۷۰-۷۵

بے شک یہ قرآن بنی اسرائیل پر بھی ان بہت سی چیزوں کو واضح کر رہا ہے جن میں وہ اختلاف کر رہے ہیں۔ اور یہ ہدایت اور رحمت ہے ایمان لانے والوں کے لیے۔ بے شک تیرا رب اپنے حکم ناطق کے ذریعہ سے ان کے درمیان فیصلہ فرمائے گا اور وہ غالب اور علم والا ہے۔ پس اللہ پر بھروسہ رکھو بے شک واضح حق پر تمہی ہو۔ ۷۶ - ۷۹

تم مردوں کو نہیں سنا سکتے اور نہ بہروں کو اپنی پکار سنا سکتے جب کہ وہ پیٹھ پھیر کر بھاگے جا رہے ہوں اور نہ تم اندھوں کو ان کی گمراہی سے پھیر کر راہ پر لانے والے بن سکتے۔ تم تو بس انہی کو سنا سکتے ہو جو ہماری آیتوں پر ایمان لائیں۔ پس وہی فرمانبردار بنیں گے۔ ۸۰ - ۸۱

اور جب ان پر بات پوری ہو جائے گی تو ہم ان کے لیے زمین سے کوئی جانور نکال کھڑا کریں گے جو ان کو بتائے گا کہ لوگ ہماری آیات پر یقین نہیں رکھتے تھے۔ اور اس دن کا خیال کرو جس دن ہم ہر امت میں سے ان لوگوں کی ایک فوج اکٹھا کریں گے جو ہماری آیات کی تکذیب کرتے تھے پس ان کی درجہ بندی کی جائے گی۔ یہاں تک کہ جب وہ اکٹھے ہو جائیں گے تو پوچھے گا کہ کیا تم نے میری آیات کو جھٹلایا حالانکہ تمہارا علم ان کا احاطہ نہ کر سکا تھا یا کیا کرتے رہے تھے! اور ان پر بات پوری ہو جائے گی بوجہ اس کے کہ انھوں نے اپنی جانوں پر ظلم ڈھائے پس وہ کچھ نہ بول سکیں گے۔ ۸۲ - ۸۵

کیا انھوں نے نہیں دیکھا کہ ہم نے رات کو تاریک بنایا تاکہ وہ اس میں آرام کریں اور دن کو روشن بنایا تاکہ اس میں کام کریں۔ بے شک اس میں نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو ایمان لانا چاہیں۔ ۸۶

اور اس دن کا خیال کرو جس دن صور پھونکا جائے گا تو جو بھی آسمانوں اور زمین میں ہیں

سب گھبرا اٹھیں گے۔ صرف وہی اس سے محفوظ رہیں گے جن کو اللہ چاہے گا اور سب اس کے آگے سرفگندہ ہو کر حاضر ہوں گے۔ اور تم پہاڑوں کو دیکھ کر گمان کرو گے کہ وہ ٹکے ہوئے ہیں حالانکہ وہ بادلوں کی طرح اڑ رہے ہوں گے۔ یہ اس خدا کی کاریگری ہو گی جس نے ہر چیز کو محکم کیا۔ بے شک وہ ہر اس چیز سے باخبر ہے جو تم کر رہے ہو۔ جو نیکی کے ساتھ حاضر ہوں گے تو ان کے لیے اس سے بہتر صلہ ہے اور وہ اس دن ہر گھبراہٹ سے مامون رہیں گے۔ اور جو برائی کے ساتھ آئیں گے تو وہ اوندھے منہ جہنم میں جھونک دیے جائیں گے کہ تم کو بدلے میں وہی مل رہا ہے جو تم کرتے رہے ہو۔ ۸۷-۹۰

مجھے تو بس یہی حکم ملا ہے کہ میں اس شہر کے رب کی بندگی کروں جس نے اس کو محترم ٹھہرایا اور جس کے اختیار ہی میں سب کچھ ہے اور مجھے حکم ملا ہے کہ میں فرماں برداری کرنے والوں میں سے بنوں اور قرآن کو سناؤں تو جو ہدایت کی راہ اختیار کرے گا وہ اپنے ہی فائدے کے لیے اختیار کرے گا اور جو گمراہی اختیار کرے گا تو تم کہہ دو کہ میں تو بس ایک آگاہ کر دینے والا ہوں۔ اور کہہ دو کہ سزاوار شکر اللہ ہے۔ وہ تمھیں اپنی نشانیاں دکھائے گا تو تم ان کو پہچان جاؤ گے اور جو کچھ تم لوگ کر رہے ہو اس سے تمھارا رب غافل نہیں ہے۔ ۹۱-۹۳

---

## ۹۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

قُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ وَسَلٰمٌ عَلٰى عِبَادِهِ الَّذِيْنَ اصْطَفٰى ط آٰللّٰهُ خَيْرٌ اَمَّا يُشْرِكُوْنَ (۵۹)

ایک بلیغ گریز اور خوبصورت حلقۂ اتصال

اس آیت کی نوعیت پیچھے اور آگے کے مطالب کے درمیان ایک بلیغ گریز اور نہایت خوب صورت حلقۂ اتصال کی ہے۔ اوپر جو واقعات مذکور ہوئے ہیں ان سے دو حقیقتیں نہایت واضح ہو کر سامنے آگئی ہیں۔ ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ اس دنیا کو پیدا کر کے اس سے بے تعلق نہیں ہو بیٹھا ہے بلکہ اس کے عدل اور اس کی رحمت کی نشانیاں برابر اس میں ظاہر ہوتی رہی ہیں۔ اس نے سرکشی کرنے والوں کو سزائیں بھی بڑی سخت دی ہیں اور

اپنے منتخب اور برگزیدہ بندوں کی نصرت بھی برابر فرماتی ہے۔

رد شرک پر ایک اہم خطبہ

دوسری یہ کہ سارا اختیار و اقتدار اللہ وحدہ لا شریک ہی کے ہاتھ میں ہے۔ اس کے علاوہ جن کی پرستش کی گئی ان کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ وہ وقت آنے پر نہ اپنے کو خدا کی پکڑ سے بچا سکے اور نہ اپنے پجاریوں کو۔

اب یہ آیت اسی خلاصہ کو سامنے پیش کر کے آگے توحید پر جو خطبہ آ رہا ہے اس کے لیے تمہید استوار کر رہی ہے۔ فرمایا کہ جو لوگ تمھاری اور تمھاری پیش کردہ کتاب کی تکذیب کر رہے ہیں ان سے کہہ دو کہ یہ سرگزشتیں جو تمھیں سنائی گئی ہیں ان سے یہ حقیقت سورج کی طرح روشن ہو کر سامنے آ گئی ہے کہ شکر کا سزاوار صرف اللہ ہے جس نے اپنے عدل و رحمت کی یہ نشانیں دکھائی ہیں اور یہ کہ سلامتی اور نجات، اللہ کے ان بندوں ہی کے لیے ہے جن کو وہ دعوتِ حق اور خدمتِ خلق کے لیے منتخب فرماتا ہے۔ ان کے دشمن کتنے ہی زور لگائیں لیکن وہ ان کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے۔ اللہ ان کی حفاظت، فرماتا ہے اور ان کے ہاتھوں حق کا بول بالا ہوتا ہے۔

اس کے بعد فرمایا کہ اصل حقیقت تو یہ ہے جو تاریخ کے ان دلائل سے ثابت ہوئی تو ان سے پوچھو کہ کیا عبادت و شکر گزاری کے لیے اللہ بہتر ہے جس کی یہ نشانیں بیان ہوئیں یا ان کے وہ مزعومہ شرکاء و شفعاء جو نہ اپنی کسی مدد پر قادر ہیں اور نہ اپنے پجاریوں کی، اب آگے اسی مضمون سے توحید کے بیان کے لیے گریز ہے۔

أَمَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ وَأَنْزَلَ لَكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَآءً ۚ فَأَنْۢبَتْنَا بِهٖ حَدَآئِقَ ذَاتَ بَهْجَةٍ ۚ مَا كَانَ لَكُمْ أَنْ تُنْۢبِتُوْا شَجَرَهَا ۗ ءَإِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ۚ بَلْ هُمْ قَوْمٌ يَّعْدِلُوْنَ (۶۰)

عربیت کا ایک خاص اسلوب

اس آیت اور اس کے بعد کی آیات کے صحیح زور کو سمجھنے کے لیے عربیت کے اس اسلوب کو ذہن میں تازہ کر لیجیے جس کی طرف ہم اس کتاب میں جگہ جگہ اشارہ کرتے آئے ہیں کہ اس قسم کے سوالیہ جملوں میں مقصود استفہام اور سوال و جواب نہیں ہوتا بلکہ افحام، اتمام حجت اور زجر و تنبیہ ہوتا ہے۔ متکلم پورے زور بیان کے ساتھ سوالیہ انداز میں حقائق کو پیش کرتا جاتا ہے اور مخاطب کی طرف سے کسی جواب کا انتظار کیے بغیر آگے بڑھ جاتا ہے۔ گویا اس کی تردید میں کچھ کہنے کے لیے کوئی گنجائش کسی کے لیے سرے سے ہے ہی نہیں۔ اسی زورِ بیان کے تقاضے سے اس قسم کے جملوں میں بعض اجزائے کلام حذف کر دیے جاتے ہیں جن کو مخاطب خود سمجھ لیتا ہے یا اس کو سمجھ لینا چاہیے۔ کلام کے اس خلا کو متکلم کا زورِ کلام بھر دیتا ہے۔ خطبائے جاہلیت کے کلام میں اس حذف و ایجاز کی مثالیں بہت ہیں لیکن قرآن کے آگے ان کو پیش کرنا آفتاب کے آگے دیا جلانا ہے۔ اردو میں یہ اسالیب چونکہ نہیں ہیں اس وجہ سے ترجمہ میں ہم نے کلام کے محذوفات، کھول دیے ہیں۔

اہتمام ربوبیت و توفیقِ اضداد

'أَمَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ' سے پہلے اتنی بات گویا محذوف ہے کہ بتاؤ، تمھارے وہ معبود بہتر ہیں جن کا نہ اس کائنات کی خلق و تدبیر میں کوئی حصہ ہے نہ تمھاری پرورش و پرداخت میں یا وہ ذات بہتر ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اور تمھارے لیے اس نے آسمان سے پانی اتارا جس سے اس نے

خوش منظر باغ اگائے۔ جن کے درختوں کو اگا سکنے پر تم قادر نہیں تھے۔

'فَاَنْۢبَتْنَا بِهٖ حَدَآئِقَ ذَاتَ بَهْجَةٍ' میں اسلوبِ کلام بدل گیا ہے۔ اوپر کے ٹکڑے میں غائب کے اسلوب میں بات فرمائی گئی تھی اب یہاں متکلم کا اسلوب آ گیا ہے۔ یہ امتنان و احسان اور عنایت و ربوبیت کے اظہار کے لیے ہے۔

'ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ' یعنی بتاؤ کیا ان سارے کاموں کے کرنے میں خدا کے ساتھ کوئی اور معبود بھی شریک رہا ہے! ظاہر ہے کہ نہیں۔ تو پھر تم نے ان کی پرستش کس حق کی بنا پر شروع کر دی۔ یہاں وہ بات یاد رکھیے جو ہم جگہ جگہ ذکر کرتے آ رہے ہیں کہ مشرکین آسمان و زمین کا خالق یا ابر و ہوا کا مصرف خدا ہی کو مانتے تھے۔

'یَعْدِلُوْنَ' کا مفہوم

'بَلْ هُمْ قَوْمٌ یَّعْدِلُوْنَ' 'یَعْدِلُوْنَ' یہاں 'عَدَلَ یَعْدِلُ عَدْلًا' سے ہے جس کے معنی 'جَارَ وَظَلَمَ' کے آتے ہیں۔ یعنی ان لوگوں کے پاس اپنے معبودوں کے حق میں کوئی دلیل تو ہے نہیں لیکن یہ کج رو اور حق ناشناس لوگ ہیں اس وجہ سے یہ خدا کو چھوڑ کر دوسروں کی پرستش کرتے ہیں۔ یہاں یہ امر بھی ملحوظ رہے کہ اوپر اسلوب خطاب کا تھا لیکن یہ اسلوب غائب کا آ گیا۔ یہ نفرت و کراہت اور اظہارِ حسرت پر دلیل ہے۔ گویا بات ان سے منہ پھیر کر فرمائی گئی ہے۔

اَمَّنْ جَعَلَ الْاَرْضَ قَرَارًا وَّجَعَلَ خِلٰلَهَآ اَنْهٰرًا وَّجَعَلَ لَهَا رَوَاسِیَ وَجَعَلَ بَیْنَ الْبَحْرَیْنِ حَاجِزًا ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ (۶۱)

یہاں بھی سوال کا پہلا جزو محذوف ہے۔ یعنی بتاؤ، تمہارے یہ فرضی دیوی دیوتا مستحق عبادت ہیں یا وہ ذات جس نے تمہارے لیے زمین کو گہوارہ بنایا! 'قَرَار' کے معنی سکون و قرار کی جگہ کے ہیں۔ زمین کو دوسرے مقامات میں گہوارہ اور بستر سے بھی تعبیر فرمایا ہے۔ وہی مضمون یہاں لفظ 'قَرَار' سے ادا کیا گیا ہے۔

'وَجَعَلَ خِلٰلَهَآ اَنْهٰرًا' یعنی جس طرح اس نے تمہاری پرورش کے لیے آسمان سے پانی اتارا اسی طرح اس زمین میں بھی دریا اور چشمے جاری کر دیے۔

'وَجَعَلَ لَهَا رَوَاسِیَ' اور اس زمین کو اپنے محور و مستقر پر ٹکائے رکھنے کے لیے اس نے اس میں پہاڑ گاڑ دیے کہ کہیں یہ تم کو لیے ہوئے کسی جانب کو لڑھک نہ جائے۔

'وَجَعَلَ بَیْنَ الْبَحْرَیْنِ حَاجِزًا' 'بَحْرَیْنِ' سے مراد، جیسا کہ قرآن کے دوسرے مقامات میں تصریح ہے، کھاری اور شیریں پانی کے دریا ہیں، فرمایا کہ یہ اسی کی قدرت و حکمت ہے کہ وہ ایک طرف سے شیریں پانی کے دریا کو چھوڑتا ہے اور دوسری طرف سے کھاری پانی کے سمندر کو، دونوں آپس میں ملتے ہیں لیکن دونوں کے درمیان اللہ تعالیٰ ایک غیر مرئی دیوار کھڑی کر دیتا ہے، مجال نہیں کہ ان میں سے کوئی بھی اس دیوار کو لانگ کر دوسرے کے حدود میں مداخلت کر سکے۔ فرمایا کہ بتاؤ، اس قدرت، اس

حکمت، اس اہتمام ربوبیت، اس تزئینِ اضداد اور اس قیام توازن و توافق میں خدا کے ساتھ تمھارے معبودوں کا بھی کوئی حصہ ہے! اگر نہیں ہے اور بالکل بدیہی طور پر معلوم ہے کہ نہیں ہے تو آخر خدا کی خدائی میں وہ کس حق کی بنا پر ساجھی بنا دیے گئے ہیں!

بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ۔ یہ غائب کا اسلوب یہاں اظہارِ حسرت و افسوس کے لیے ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ باتیں تو بالکل بدیہی ہیں لیکن افسوس ہے کہ ان میں کے اکثر ان کو نہیں جانتے اور بتانے پر بھی ان کا حال یہ ہے کہ ان کو جاننا نہیں چاہتے۔

اَمَّنْ يُّجِيْبُ الْمُضْطَرَّ اِذَا دَعَاهُ وَيَكْشِفُ السُّوْٓءَ وَيَجْعَلُكُمْ خُلَفَآءَ الْاَرْضِ ؕ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ؕ قَلِيْلًا مَّا تَذَكَّرُوْنَ (۶۲)

توجیہِ دعا کے باب میں بعض حقائق

اس سے پہلے بھی اُسی طرح کا سوال محذوف ہے جس کی مثالیں اوپر گزر چکی ہیں۔ یعنی بتاؤ، تمھارے یہ دیوی دیوتا بہتر ہیں جو نہ سنتے نہ دیکھتے، نہ ضرر پہنچا سکتے، نہ نفع، نہ کسی کی فریاد رسی پر قادر نہ کسی کی مدد پر یا وہ ذات جو مضطر کی فریاد رسی اور اس کے دکھ درد کا ازالہ کرتی ہے! یعنی جس کی بھی فریاد رسی ہوتی ہے بہرحال اسی کی طرف سے ہوتی ہے، کسی اور کی طرف سے نہیں ہوتی۔ یہاں یہ امر یاد رکھیے کہ یہی مضمون قرآن کے دوسرے مقامات میں مشیت الٰہی کی قید کے ساتھ بیان ہوا ہے۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی مشیت و حکمت جس کے لیے مقتضی ہوتی ہے اس کے دکھ درد کو دور فرما دیتا ہے اور کسی حقیقی مضطر کی فریاد رسی اگر بروقت نہیں ہوتی تو کسی دوسرے زیادہ موزوں تر وقت کے لیے اٹھا رکھی جاتی ہے اور اگر اس شکل میں نہیں ہوتی جس شکل میں وہ چاہتا ہے تو اس سے مختلف اور بہتر شکل میں پوری ہوتی ہے اور اگر اس دنیا میں نہیں ہوتی تو وہ آخرت میں اس کے لیے موجبِ اجر ہوگی۔ تبولیتِ فریاد و دعا کے باب میں ان باتوں کی وضاحت ان کے محل میں ہو چکی ہے۔ اس ٹکڑے کو ان تمام اصولی حقائق کی روشنی میں سمجھیے۔

قوموں کا ردوبدل تمام تر خدا کے اذن سے ہوتا ہے

وَيَجْعَلُكُمْ خُلَفَآءَ الْاَرْضِ۔ اسلوب بیان دلیل ہے کہ یہاں مراد ایک قوم کو ہٹا کر دوسری قوم کو اس کی جانشین بنانا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اس دنیا میں یہ جو دیکھتے ہو کہ ایک قوم مٹتی اور دوسری قوم اس کی جگہ لیتی ہے تو نہ یہ اتفاقی واقعات ہیں اور نہ یہ ردوبدل کرنے پر خدا کے سوا کوئی دوسرا قادر ہے۔ یہ سب کچھ خدا ہی کے حکم اور اسی کی حکمت کے تحت ہوتا ہے۔ یہ قریش کو تنبیہ ہے کہ اگر آج تم کو اس سرزمین میں اقتدار حاصل ہے تو یہ تمھارا اپنا حاصل کردہ نہیں ہے بلکہ یہ خدا ہی کا عطا کردہ ہے۔ یہ اقتدار دے کر وہ تمھارا امتحان کر رہا ہے کہ تم اس کو پا کر کیا بناتے ہو؟ اگر تم نے بھی وہی روش اختیار کی جو تم سے پہلے مفسدین نے اختیار کی تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ تمھارے سامنے بھی وہی انجام نہ آئے جو ان کے سامنے آیا۔ خدا کا معاملہ سب کے ساتھ ایک ہی اصول کے مطابق ہے

قوموں کی خود فراموشی

ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ؕ قَلِيْلًا مَّا تَذَكَّرُوْنَ۔ یعنی ان میں سے کون سا کام ایسا ہے جس کے

بارے میں تم کہہ سکتے ہو کہ اس میں خدا کے سوا کسی اور کی قدرت و مشیت کا بھی کوئی دخل ہے لیکن تم وہ خود فراموش لوگ ہو کہ بہت کم یاد دہانی حاصل کرتے ہو۔ مطلب یہ ہے کہ زندگی میں جو تنبیہات اور آزمائشیں پیش آتی ہیں ان کے پیش آنے پر تو تم خدا خدا پکارتے ہو لیکن جب وہ گزر جاتی ہیں تو خدا کو بھول کر پھر اپنی خود فراموشیوں میں گم ہو جاتے ہو اور تمھیں یاد بھی نہیں رہتا کہ کبھی تم نے خدا کو پکارا بھی تھا اور اس سے کوئی قول و قرار بھی کیا تھا!

یہ مضمون دوسرے مقامات میں نہایت وضاحت سے بیان ہو چکا ہے۔ اسی طرح تاریخ نے قوموں کے ردوبدل سے متعلق جو درسِ عبرت و موعظت تمھارے لیے محفوظ کیے ہیں وہ بھی تمھیں صرف اس وقت یاد آتے ہیں جب سب کچھ تمھارے اپنے سروں پر گزر جائے۔ گزر جانے کے بعد تمھارے لیے تاریخ بھی عہدِ ماضی کا ایک افسانہ بن کر رہ جاتی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اس آیت کے دونوں ٹکڑوں اَمَّنْ یُّجِیْبُ الْمُضْطَرَّ اِذَا دَعَاهُ اور یَجْعَلُكُمْ خُلَفَآءَ الْاَرْضِ میں بڑا گہرا معنوی ربط ہے۔ مطلب یہ ہے کہ نہ تم ان مصائب سے کوئی سبق حاصل کرتے ہو جو تمھاری انفرادی زندگیوں میں پیش آتے ہیں اور نہ اس ردوبدل ہی سے کوئی عبرت پکڑتے جس سے قوموں کو دوچار ہونا پڑتا ہے تو جن کی یادداشت اتنی کمزور ہو ان کو کون سبق پڑھا سکتا ہے!

اَمَّنْ یَّهْدِیْكُمْ فِیْ ظُلُمٰتِ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَمَنْ یُّرْسِلُ الرِّیٰحَ بُشْرًۢا بَیْنَ یَدَیْ رَحْمَتِهٖ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ تَعٰلَى اللّٰهُ عَمَّا یُشْرِكُوْنَ (۶۳)

اس سے پہلے بھی اسی طرح کا سوال محذوف ہے جس کی مثالیں اوپر گزر چکی ہیں۔ یعنی خشکی و تری کی تاریکیوں میں جو رستہ دکھاتا ہے اور ابرِ رحمت سے پہلے جو موسمی ہواؤں کو چلاتا ہے وہ لائق عبادت اور سزاوارِ شکر ہے یا تمھارے یہ ناکارہ معبود جو کسی مصرف کے نہیں ہیں؟ بر و بحر میں رستہ دکھانے کے لیے اللہ تعالیٰ نے جو انتظام فرمایا ہے اس کی وضاحت قرآن میں جگہ جگہ ہوئی ہے۔ یہی مضمون دوسرے مقام میں وَعَلٰمٰتٍ وَبِالنَّجْمِ هُمْ یَهْتَدُوْنَ (النحل ۱۶) کے الفاظ سے بیان ہوا ہے۔ یعنی خدا نے زمین میں بھی نشانات گاڑ دیے ہیں اور آسمان میں بھی ستاروں کے قمقمے لگا دیے ہیں جو خشکی و تری دونوں کی تاریکیوں میں مسافروں کی رہنمائی کرتے ہیں جو اس بات کی صاف شہادت ہے کہ اس کائنات کا خالق نہایت مہربان و کریم اور خشکی و تری اور آسمان و زمین ہر جگہ تنہا اسی کا اختیار و اقتدار ہے اور وہی ہے جو زمین کے خشک ہو جانے کے بعد موسمی ہواؤں کو اپنے ابرِ رحمت کی بشارت بنا کر ابھارتا ہے جو بادلوں کے ٹکڑے جمع اور ان کو تہ بہ تہ کرتی ہیں اور پھر وہ جہاں چاہتا ہے ان کو برسا دیتا ہے۔ کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ آسمان کے خدا الگ، زمین کے خدا الگ، ابر کے دیوتا الگ اور ہواؤں کے خدا جدا ہیں؟ مطلب یہ ہے کہ اس کائنات کے ان تمام اجزائے مختلفہ کے اس توافق اور ان کی اس ہم آہنگی کے مشاہدہ کے بعد بھی اگر کوئی یہ سمجھتا ہے کہ اس میں مختلف ارادے کارفرما ہیں اور خدا کی اس خدائی میں دوسرے دیوی دیوتا بھی شریک ہیں تو وہ نہایت کودن ہے۔ اس کائنات کا خالق ان فرضی دیویوں اور دیوتاؤں سے منزّہ اور ارفع ہے! اللہ تعالیٰ جل شانہ کے ساتھ ان حقیر چیزوں

زمین اور آسمان دونوں میں ایک ہی خدا کی خدائی ہے

کا کوئی جوڑ نہیں ہے۔

اَمَّنْ یَّبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ یُعِیْدُهٗ وَمَنْ یَّرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ ؕ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ؕ قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ (۶۴)

ایک بدیہی حقیقت کا بدیہی نتیجہ

یہاں بھی سوال کا ایک حصہ محذوف ہے جو قرینہ سے واضح ہوتا ہے۔ یعنی تمہارے یہ اصنام و اوثان لائقِ عبادت ہیں یا وہ ذات جس نے اس خلق کا آغاز کیا اور ہر چیز کو وجود میں لاتی ہے؟ اس کے ساتھ ثُمَّ یُعِیْدُهٗ ملا کر ابداءِ خلق کے ایک بدیہی نتیجہ کو ظاہر فرما دیا کہ جب وہی ہر چیز کا آغاز فرماتا ہے تو وہ اس کا اعادہ بھی کر سکتا ہے اور وہ ایسا لازماً کرے گا بھی۔ اگر وہ نہ کرے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اس نے یہ سارا کارخانہ بالکل عبث بنایا ہے۔ دوسرے مقامات میں یہ بات دلائل کی تفصیل کے ساتھ بیان ہوئی ہے۔ یہاں یہ ایک بدیہی حقیقت کے ایک بدیہی نتیجہ کے طور پر بیان کر دی گئی ہے کہ جب اس کائنات کے ابداء سے انکار کی گنجائش نہیں ہے تو اس کے اعادہ میں شک کی گنجائش کہاں سے نکلی!

وَمَنْ یَّرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ یعنی خلق کے بعد وہی ہے جو تمہاری رزق رسانی اور پرورش کا سامان کرتا ہے اور اس کام میں وہ آسمان کو بھی استعمال کرتا ہے اور زمین کو بھی ——— آسمان سے وہ تمہارے لیے پانی برساتا ہے اور زمین سے تمہارے لیے طرح طرح کی چیزیں اگاتا ہے۔ کیا تم کہہ سکتے ہو کہ ان کاموں میں کوئی اور بھی شریک ہے!

خلاصۂ بحث

قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ۔ مطلب یہ کہ یہ ساری چیزیں جو مذکور ہوئیں ان کا کوئی فاعل ماننا تو ناگزیر ہے، بغیر کسی فاعل حکیم و قدیر کے یہ چیزیں وجود میں نہیں آگئی ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ ایک خدائے حی و قیوم کا وجود تو برہان قطعی سے ثابت ہے اس وجہ سے اس کو ہم مانتے ہیں اور تمہارے لیے بھی اس کے ماننے کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے۔ اب اگر تم یہ دعویٰ کرتے ہو کہ اس ایک کے سوا کچھ اور خدا بھی ہیں تو ان کے ثبوت کے لیے دلیل پیش کرنا تمہاری ذمہ داری ہے۔ اگر ان کے حق میں تمہارے پاس کوئی برہان ہے تو اس کو پیش کرو۔

شرک کی دلیل مشرکین پیش کریں

اس ساری بحث کا خلاصہ دو لفظوں میں یوں پیش کیا جا سکتا ہے کہ جو خدا کو نہیں مانتا ان سوالوں کا کوئی اطمینان بخش جواب دے جو اوپر مذکور ہوئے اور اگر مانتا ہے لیکن اس کے ساتھ دوسرے خداؤں کو بھی شریک کرتا ہے تو وہ ان خداؤں کے حق میں دلیل پیش کرے۔ دلیل و ثبوت کی ذمہ داری بہر حال منکروں یا مشرکوں پر ہے۔ خدا کے ماننے والوں پر کسی چیز کو ثابت کرنے کی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی۔ وہ تو ایک بدیہی حقیقت کو مانتے ہیں۔

قُلْ لَّا یَعْلَمُ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الْغَیْبَ اِلَّا اللّٰهُ ؕ وَمَا یَشْعُرُوْنَ اَیَّانَ یُبْعَثُوْنَ (۶۵)

یہ توحید و شرک کی اس بحث کی آخری بات ہے کہ اگر کسی کو یہ غلط فہمی ہے کہ آسمانوں اور زمین

کے اندر غیب کا علم کسی اور کو بھی ہے اس وجہ سے وہ لائق عبادت ہے تو اس کی یہ غلط فہمی بھی دُور کر دو کہ غیب کا علم خدا کے سوا آسمانوں اور زمین میں کسی کو بھی نہیں ہے۔ جب آسمان والوں میں سے بھی کسی کو غیب کا پتہ نہیں تو زمین والوں کا کیا سوال! فرمایا کہ غیب کا علم تو درکنار ان کو یہ بھی خبر نہیں کہ وہ کب اٹھائے جائیں گے! یعنی جب انھیں اپنے اٹھائے جانے کی بھی خبر نہیں تو ان کی شفاعت کے بھروسہ پر ان کو معبود مان کر ان کی پرستش کرنے کے کیا معنی! یہ مضمون سورۂ نحل کی آیات ۲۰-۲۱ میں بھی گزر چکا ہے۔ وہاں ہم اس کے ہر پہلو پر بحث کر چکے ہیں۔

بَلِ ادّٰرَكَ عِلْمُهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ تَدْ بَلْ هُمْ فِيْ شَكٍّ مِّنْهَا قَدْ بَلْ هُمْ مِّنْهَا عَمُوْنَ (۶۶)

'اِدّٰرَكَ' دراصل 'تَدَارَكَ' ہے جو بقاعدۂ ادغام 'اِدّٰرَكَ' ہو گیا ہے جس طرح 'تَثَاقَلَ' سے 'اِثَّاقَلَ' بن گیا ہے۔ 'تَدَارَكَ الْقَوْمُ' کے معنی ہوں گے قوم کے اگلے پچھلے سب ایک دوسرے کے ساتھ مل گئے۔ قرآن مجید میں ہے: 'حَتّٰى اِذَا ادّٰرَكُوْا فِيْهَا جَمِيْعًا' (یہاں تک کہ جب وہ سب اس میں اکٹھے ہو لیں گے) یہیں سے اس کے اندر اختلاط اور گڈمڈ ہونے کا مفہوم بھی پیدا ہو گیا۔ اس لیے کہ جب مختلف چیزیں اکٹھی ہو جاتی ہیں تو وہ آپس میں گڈمڈ ہو جاتی ہیں۔

آخرت کے باب میں مشرکین عرب کی ذہنی الجھن

یہ بات ہم اس کے محل میں واضح کر چکے ہیں کہ مشرکین عرب کا موقف آخرت کے باب میں صریح انکار کا نہیں تھا بلکہ وہ ایک قسم کی ذہنی الجھن میں مبتلا تھے۔ اس کو ماننا چاہتے نہیں تھے اور اس کے صریح انکار کی گنجائش پاتے نہیں تھے۔ اس وجہ سے وہ ایک قسم کی گومگو کی حالت میں مبتلا تھے۔ بعض منہ پھٹ اور بالکل لاأبالی قسم کے لوگ اگرچہ ضد کے جوش میں اس کا انکار بھی کر بیٹھتے تھے لیکن عام حالت یہ نہیں تھی بلکہ، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، ایک ذہنی الجھن ہی کی تھی۔ وہ اس کو نہ ماننے کی خواہش کے تحت ایک نہایت ہی مستبعد بات قرار دیتے تھے کہ بھلا مر جانے اور سڑ گل جانے کے بعد دوبارہ پیدا کرنا اور ساری دنیا کا حساب کتاب اور ان کی جزا و سزا کس کے بس کی بات ہے! لیکن اس پر بھی ان کا ذہن پوری طرح مطمئن نہیں تھا اس وجہ سے اپنی تسلی کے لیے وہ یہ بھی کہتے تھے کہ بالفرض مرنے کے بعد اٹھنا ہی پڑا اور حساب کتاب کی نوبت آہی گئی تو ہمارے دیوی دیوتا اپنی سعی و سفارش سے ہمیں بچا ہی لیں گے، اس کے لیے فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ قرآن نے ان کی اسی ذہنی کشمکش کو 'ادّٰرَكَ عِلْمُهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ' سے تعبیر فرمایا ہے اور یہ نہایت ہی حقیقت افروز تعبیر ہے لیکن تعجب ہوتا ہے کہ ہمارے مفسرین اس کی تاویل میں معلوم نہیں کس طرح الجھن میں پڑ گئے!

یہ آیت یہاں بالکل اسی محل میں ہے جس محل میں تمہید کی آیت ۵ ہے۔ جس طرح وہاں فرمایا ہے کہ اگرچہ یہ قرآن بالکل واضح ہے لیکن جو لوگ آخرت کو نہیں مانتے ہیں اور نہ ماننا چاہتے ہی ہیں وہ اس پر ایمان نہیں لائیں گے اسی طرح توحید کے اثبات اور شرک کے ابطال پر یہاں ناقابلِ انکار دلائل پیش کرنے کے بعد

فرمایا کہ یہ نہ خیال کرو کہ سورج کی طرح یہ روشن حقائق ان کی سمجھ میں نہیں آرہے ہیں بلکہ اصل وجہ یہ ہے کہ آخرت کے باب میں یہ سخت ذہنی الجھن میں مبتلا ہیں، اس کی طرف سے یہ شک میں پڑے ہوتے ہیں بلکہ اس کی طرف سے اندھے بنے ہوئے ہیں۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ حقائق سے گریز و فرار کی اصل علت آخرت سے گریز و فرار ہی ہے۔ آخرت کو مان لینے سے چونکہ انسان پر عظیم ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں اس وجہ سے وہ اس سے بھاگتا ہے۔ اور فرار کے لیے چونکہ کوئی راہ نہیں ہے اس وجہ سے وہ چور دروازے تلاش کرتا ہے۔ یہ چیز اس کو ایک شدید ذہنی الجھن میں مبتلا کر دیتی ہے۔ وہ حقائق سے گریز کے لیے ان کے اندر شک کے پہلو ڈھونڈتا ہے۔ یہ غیر فطری جستجو اس کو شک کا مریض بنا دیتی ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اسے صریح حقائق سے آنکھیں بند کر کے اندھا بننا پڑتا ہے۔ گویا قرآن نے اس آیت میں ان کے مرض کے تدریجی ارتقاء کو واضح فرمایا کہ انھوں نے آخرت کو نہ ماننے کی خواہش کے تحت اپنے ذہن و فکر کو مریض بنایا۔ پھر جب وہ شک کے مریض بن گئے تو انھیں آفاق و انفس کے تمام شواہد و حقائق سے آنکھیں بند کر لینی پڑیں اس لیے کہ اس میں حقائق کا مواجہ ان کی طبیعت پر نہایت شاق گزرتا ہے۔

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا ءَاِذَا كُنَّا تُرٰبًا وَّاٰبَآؤُنَآ اَئِنَّا لَمُخْرَجُوْنَ ۝ لَقَدْ وُعِدْنَا هٰذَا نَحْنُ وَاٰبَآؤُنَا مِنْ قَبْلُ ۙ اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ (۶۷-۶۸)

یہ ان کے شک کی وضاحت ہے کہ اول تو ان کو یہی بات عجیب معلوم ہوتی ہے کہ جب وہ سڑگل کر مٹی ہو جائیں گے تو دوبارہ از سر نو قبروں سے زندہ کر کے کس طرح نکالے جائیں گے!

دوسری یہ کہ وہ کہتے ہیں کہ قیامت کی آمد آمد کا چرچا تو ہم بہت دنوں سے سن رہے ہیں۔ آج ہم کو اس سے ڈرایا جا رہا ہے، اس سے پہلے ہمارے اگلوں کو بھی ڈرایا گیا لیکن اس کو نہ آنا تھا نہ آئی۔ اس سے وہ یہ نتیجہ نکال لیتے ہیں کہ یہ سب اگلوں کے فسانے ہیں جو ہر زمانے میں دہرائے گئے ہیں، ان کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔

قُلْ سِيْرُوْا فِى الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُجْرِمِيْنَ (۶۹)

آنکھوں کے لیے سرمۂ بصیرت

یہ ان کے اس اندھے پن کا علاج بتایا ہے جس کا ذکر اوپر والی آیت میں آیا ہے۔ مطلب یہ کہ آنکھیں کھولنے سے کھلتی ہیں اس لیے اپنے ملک میں آنکھیں کھول کر چلو پھرو اور پچھلی قوموں کے آثار پر عبرت کی نگاہ ڈالو تو تمھیں نظر آئے کہ اللہ کے رسولوں نے ان کو جس عذاب سے ڈرایا وہ کس طرح ان کے سامنے آیا۔ یہ آثار اللہ نے اس زمین میں اسی لیے محفوظ رکھے ہیں کہ یہ تمھارے لیے نشان عبرت اور سرمۂ بصیرت کا کام دیں۔ اس سے تمھیں معلوم ہو جائے گا کہ جس چیز سے تمھیں ڈرایا جا رہا ہے وہ محض اگلوں کا فسانہ نہیں بلکہ یکسر حقیقت ہے۔ اور اسی سے تم پر یہ حقیقت بھی واضح ہو جائے گی کہ جب مجرموں کا یہ انجام اس دنیا میں

ہوا ہے تو آخر اللہ تعالیٰ ایک ایسا دن کیوں نہیں لائے گا جس میں اس کے کامل عدل اور اس کی کامل رحمت کا ظہور ہو!

وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ وَلَا تَكُنْ فِي ضَيْقٍ مِّمَّا يَمْكُرُونَ (۷۰)

آنحضرتؐ کو تسلی

یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی ہے کہ تم ان کی اس روش پر غم نہ کرو۔ تم ان کو زوٹی دے رہے ہو اور یہ پتھر مانگتے ہیں تو یہ ان کی اپنی محرومی و بدبختی ہے۔ تم اپنا فرض انجام دے کر ان کو ان کے حال پر چھوڑو۔ ان پر کڑھنے اور ان کی ہٹ دھرمی پر غم کھانے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔

اسی طرح ان کی ان شرارتوں سے بھی ذرا دل تنگ اور پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے جو وہ تمھارے ساتھیوں اور تمھاری دعوت کے خلاف کر رہے ہیں۔ ان کی ساری چالیں اور شرارتیں خدا کی مٹھی میں ہیں، وہ ان کی ہر چال بے کار کر دے گا اور تمھیں ہر شر سے محفوظ رکھے گا۔

وَيَقُولُونَ مَتَىٰ هَٰذَا الْوَعْدُ إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ ۝ قُلْ عَسَىٰ أَن يَكُونَ رَدِفَ لَكُم بَعْضُ الَّذِي تَسْتَعْجِلُونَ ۝ وَإِنَّ رَبَّكَ لَذُو فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَهُمْ لَا يَشْكُرُونَ (۷۱-۷۳)

'رَدِفَ' بغیر صلہ کے بھی آتا ہے اور 'لِ' کے صلہ کے ساتھ بھی آتا ہے۔ کلام عرب میں دونوں کی نظیریں ملتی ہیں۔ اس کے معنی ہیں ایک شے کے دوسری شے کے پیچھے لگے ہوئے ہونے کے۔

مکذبین کا مطالبۂ عذاب اور اس کا جواب

اللہ تعالیٰ کے رسولوں نے اپنی قوموں کو دو عذابوں سے ڈرایا ہے۔ ایک عذاب دنیا سے جو رسول کی تکذیب کی صورت میں لازماً ظاہر ہوتا ہے دوسرے عذاب آخرت سے۔ اس انذار کا جواب ان کی قوموں نے ہمیشہ یہی دیا کہ 'مَتَىٰ هَٰذَا الْوَعْدُ' یہ عذاب کب آئے گا؟ یعنی اگر تم سچے ہو تو یا تو قیامت لاؤ جس کی دھمکی سنا رہے ہو، اگر قیامت نہیں تو وہ عذاب ہی لا کر دکھاؤ جو تمھاری تکذیب کی صورت میں تمھارے گمان کے مطابق لازماً ہم پر آنے والا ہے۔ ان دونوں میں سے کوئی ایک ضرور دکھاؤ۔ اس کے بغیر ہم یہ ماننے والے نہیں ہیں کہ تم اپنے دعوے اور وعدے میں سچے ہو۔

'قُلْ عَسَىٰ أَن ...... الآية' فرمایا کہ ان سے کہہ دو کہ عجب نہیں کہ جس چیز کے لیے تم جلدی مچائے ہوئے ہو اس کا کوئی حصہ تمھارے پیچھے ہی لگا ہوا ہو۔ 'الَّذِي تَسْتَعْجِلُونَ' سے قیامت مراد ہے جس کے لیے جلدی مچانے کا ذکر اوپر آیت ۴۶ میں بھی گزر چکا ہے اور آیت ۷۱ میں بھی۔ 'بَعْض' سے مراد وہ عذاب ہے جو رسول کی تکذیب کا لازمی نتیجہ ہے۔ فرمایا کہ عذاب کے لیے جلدی نہ مچاؤ، اب تو اس کا ظہور تمھارے رویے پر منحصر ہے۔ اگر تم ایمان نہ لائے تو قیامت کی عدالتِ کبریٰ کا ایک نمونہ تمھارے لیے ظاہر ہو کے رہے گا۔ یہ چیز رسول کی بعثت ہی کے اندر مضمر ہے۔ یہاں اس بات کو 'عَسَىٰ' کے لفظ سے کہنے کی وجہ یہ ہے کہ بہرحال عذاب کے ظہور کا انحصار قوم کے رویے پر تھا۔ وہ ایمان لا کر اس سے محفوظ بھی رہ سکتی تھی۔ چنانچہ ہوا بھی یہی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی قوم کی اکثریت ایمان لائی اس وجہ سے اس پر

اس قسم کا کوئی عذاب نہیں آیا جس قسم کا عذاب پچھلی قوموں پر آیا۔

'وَاِنَّ رَبَّكَ لَذُوْ فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَشْكُرُوْنَ'۔ یہ عذاب اور قیامت کے لیے جلدی مچانے والوں کے حال پر اظہارِ افسوس ہے کہ اللہ تعالیٰ لوگوں کو جو مہلت دیتا ہے وہ اپنے فضل و کرم سے محض اس لیے دیتا ہے کہ لوگ اس سے فائدہ اٹھا کر اپنے رویے کی اصلاح کرلیں اور اس کی رحمت کے مستحق بنیں، لیکن لوگوں کی ناشکری کا حال یہ ہے کہ وہ اس مہلت اور اس فضل کو اللہ کے رسول کے جھوٹے ہونے کی دلیل بنا لیتے ہیں اور جہاں سے ان کو رحمت لے کر اٹھنا چاہیے وہاں سے وہ اس کا غضب لے کر لوٹتے ہیں۔

وَاِنَّ رَبَّكَ لَيَعْلَمُ مَا تُكِنُّ صُدُوْرُهُمْ وَمَا يُعْلِنُوْنَ ۝ وَمَا مِنْ غَآئِبَةٍ فِي السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ (۷۴-۷۵)

آنحضرتؐ کے لیے تسلی اور مخالفین کے لیے انذار

یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے تسلی بھی ہے اور آپؐ کے مخالفین کے لیے انذار بھی۔ آپؐ کو مخاطب کرکے فرمایا کہ تم ان سے بالکل بے خطر رہو۔ تمھارا رب ان کے سینوں کے مخفی منصوبوں سے بھی واقف ہے اور ان کے برملا اعلانات سے بھی۔ مطلب یہ ہے کہ وہ ان کے ہر فتنے کے تدارک کے لیے خود سامان فرمائے گا۔ یہ گویا 'لَا تَكُنْ فِيْ ضَيْقٍ مِّمَّا يَمْكُرُوْنَ' کے مضمون کی تاکید ہوئی۔

'وَمَا مِنْ غَآئِبَةٍ الآيۃ' میں مخالفین کو دھمکی ہے کہ وہ یاد رکھیں کہ آسمان و زمین کا ہر بھید خدا کے ہاں ایک واضح کتاب میں درج ہے۔ وہ ہر چیز کا نوٹس لے گا اور اس سے کوئی راز بھی چھپایا نہ جا سکے گا۔

اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ يَقُصُّ عَلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اَكْثَرَ الَّذِيْ هُمْ فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ۝ وَاِنَّهٗ لَهُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ۝ اِنَّ رَبَّكَ يَقْضِيْ بَيْنَهُمْ بِحُكْمِهٖ ۚ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْعَلِيْمُ (۷۶-۷۸)

یہود کی طرف ایک اشارہ

یہ اشارہ یہود کی طرف ہے۔ اصلاً تو یہ سورہ قریش کے جواب میں ہے اس لیے کہ دعوت کے ابتدائی دور میں قرآن کے دوسرے مخالفین —— یہود وغیرہ —— صرف دور کے تماشائی تھے لیکن دعوت کے قدم جتنے ہی آگے بڑھتے گئے آہستہ آہستہ یہود نے بھی پس پردہ قریش کی حمایت شروع کردی۔ چنانچہ قرآن نے بھی ان سے تعرض شروع کردیا۔ ابتداءً تو ان کا ذکر اشارات ہی کی شکل میں ہوا لیکن پھر بالتدریج جس طرح وہ کھلتے گئے اسی طرح قرآن کا اندازِ بیان بھی کھلتا گیا۔ یہاں تک کہ وہ بھی پوری طرح بے نقاب ہو کر سامنے آگئے۔ زیرِ بحث آیات میں ان کی طرف ایک اجمالی اشارہ ہے۔ بعد کی سورتوں میں آپ دیکھیں گے کہ بالتدریج یہ اجمال تفصیل کا رنگ اختیار کرے گا۔ یہود کے معاملہ میں یہی اندازِ بحث پچھلے گروہوں میں بھی رہا ہے۔

فرمایا کہ قرآن جس طرح بنی اسماعیل (قریش) پر اتمامِ حجت کر رہا ہے اسی طرح یہ بنی اسرائیل پر بھی

ان بہت سے حقائق کو واضح کر رہا ہے جن سے وہ اختلاف میں پڑ کر محروم ہو گئے تھے 'وَاِنَّهٗ لَهُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ' یعنی اگر وہ اس پر ایمان لانے والے بنیں تو یہ ان کو اختلافات کی بھول بھلیوں سے نکال کر دین کی صراطِ مستقیم پر لائے گا اور ان کے لیے دنیا و آخرت دونوں میں موجبِ رحمت ہو گا 'اِنَّ رَبَّكَ يَقْضِيْ بَيْنَهُمْ بِحُكْمِهٖ' یعنی اگر انھوں نے اس قرآن کی قدر نہ پہچانی اور اس کی رہنمائی نہ قبول کی تو یاد رکھیں کہ آج تو اللہ تعالیٰ ان کے اختلافات اس کتاب کے ذریعہ سے رفع کرنا چاہتا ہے لیکن اس کے بعد وہ دن بھی آنے والا ہے جس میں وہ اپنے حکمِ ناطق کے ذریعہ سے ان کے درمیان فیصلہ فرمائے گا۔ یہاں واضح قرینہ موجود ہے کہ یہ بات روزِ قیامت سے متعلق فرمائی گئی ہے اور حکم سے مراد وہ حتمی و آخری فیصلہ ہے جس کے بعد کسی کے لیے زبان کھولنے کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہے گی۔

'هُوَ الْعَزِيْزُ الْعَلِيْمُ' یہ اللہ تعالیٰ نے اپنی صفات کا حوالہ دیا ہے کہ یہود یاد رکھیں کہ اللہ عزیز و علیم ہے۔ نہ کوئی اس کا ہاتھ پکڑ سکتا اور نہ کوئی چیز اس سے مخفی ہے۔

یہی مضمون بعینہٖ اسی طرح کے موقع و محل میں سورۂ یونس میں بھی گزر چکا ہے۔ فرمایا ہے۔

وَلَقَدْ بَوَّاْنَا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ مُبَوَّاَ صِدْقٍ وَّرَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ ۚ فَمَا اخْتَلَفُوْا حَتّٰى جَآءَهُمُ الْعِلْمُ ۭ اِنَّ رَبَّكَ يَقْضِيْ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فِيْمَا كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ۔ (یونس: ۹۳)

اور ہم نے بنی اسرائیل کو عزت و استحکام کا مقام بخشا اور ان کو اپنے پاکیزہ رزق و فضل سے نوازا تو علم پانے کے بعد انھوں نے اس میں اختلاف پیدا کیا۔ بے شک تمہارا رب قیامت کے دن ان چیزوں کے باب میں ان کے درمیان فیصلہ فرمائے گا جن میں وہ اختلاف کرتے رہے ہیں۔

سورۂ ہود میں یہی مضمون اس طرح آیا ہے۔

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ فَاخْتُلِفَ فِيْهِ ۭ وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ لَقُضِيَ بَيْنَهُمْ ۭ وَاِنَّهُمْ لَفِيْ شَكٍّ مِّنْهُ مُرِيْبٍ۔ (ھود: ۱۱۰)

اور ہم نے موسیٰ کو کتاب عطا کی تو اس میں اختلاف پیدا کر دیا گیا اور اگر تیرے رب کی طرف سے ایک بات پہلے طے نہ ہو چکی ہوتی تو ان کے درمیان فیصلہ کر دیا جاتا اور بے شک وہ اس کی طرف سے ایک الجھن میں ڈال دینے والے شک میں پڑے ہوئے ہیں۔

یہاں جس اختلاف کی طرف اشارہ فرمایا گیا ہے اس کی وضاحت سورۂ یونس اور سورۂ ہود کی مذکورہ بالا آیات کے تحت بھی ہو چکی ہے اور سورۂ بقرہ کی تفسیر میں بھی۔ تورات کے متعلق یہ بات یاد رکھیے کہ اس میں صرف تحریف ہی نہیں ہوئی ہے بلکہ وہ متناقض روایات کا مجموعہ بھی ہے۔ اس سے یہ پتہ چلانا ناممکن ہے کہ اس میں کتنا حصہ حق ہے اور کتنا باطل و محرف۔ تورات کے اس طرح مسخ ہو جانے کے سبب سے یہود خدا کی دی

بری روشنی سے محروم ہو کر بالکل تاریکی میں گھر گئے تھے۔ قرآن نے ان کو اس تاریکی سے نکال کر روشنی میں لانا چاہا لیکن انھوں نے اس روشنی کی قدر کرنے کے بجائے اس کو بجھانے کی کوشش کی۔

فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ۖ إِنَّكَ عَلَى الْحَقِّ الْمُبِينِ ۝ إِنَّكَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتٰى وَلَا تُسْمِعُ الصُّمَّ الدُّعَآءَ إِذَا وَلَّوْا مُدْبِرِينَ ۝ وَمَآ أَنْتَ بِهٰدِي الْعُمْيِ عَنْ ضَلٰلَتِهِمْ ۖ إِنْ تُسْمِعُ إِلَّا مَنْ يُّؤْمِنُ بِاٰيٰتِنَا فَهُمْ مُّسْلِمُونَ (۷۹-۸۱)

آنحضرتؐ کے لیے تسلی

یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی گئی ہے کہ تم ان لوگوں کی چالوں اور مخالفتوں سے بالکل بے پروا ہو کر اپنے رب کی نصرت پر بھروسہ رکھو، واضح حق پر تم ہی ہو۔ اس حق کا بول بالا ہو کر رہے گا اور تمھارے یہ مخالفین، خواہ قریش ہوں یا یہود، اپنے باطل کے ذریعہ سے تمھارا مقابلہ نہ کر سکیں گے۔ اللہ تعالیٰ ان کی ساری چالیں بیکار کر دے گا۔ اللہ کا کلمہ بلند ہو کر رہے گا۔

'إِنَّكَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتٰى الآية' یعنی اگر یہ لوگ تمھاری بات نہیں سنتے تو تم ان کے حال پر غم نہ کرو، تمھارا کام مُردوں کو سنانا نہیں ہے اور نہ بہروں کو سنانا ہے بالخصوص جب کہ وہ پیٹھ پھیر کر بھاگے جا رہے ہوں۔ 'إِذَا وَلَّوْا مُدْبِرِينَ' کی قید سے یہاں یہ بات نکلی کہ بہرے بھی اگر کان لگائیں اور دھیان کریں تو کچھ سن سکتے ہیں لیکن یہ تو وہ بہرے ہیں جو بہرے بھی ہیں اور پیٹھ پھیر کر بھاگے بھی جا رہے ہیں تو ایسے بدقسمتوں کو کوئی بات کس طرح سنائی جا سکتی ہے!

'وَمَآ أَنْتَ بِهٰدِي الْعُمْيِ عَنْ ضَلٰلَتِهِمْ' یہاں 'عَنْ' اس بات کا قرینہ ہے کہ لفظ 'هَادِيْ' کسی ایسے مفہوم پر متضمن مانا جائے جو 'عَنْ' کے ساتھ مناسبت رکھتا ہو۔ یہ حرف چونکہ کسی کو کسی شے سے ہٹانے اور پھیرنے کے مفہوم پر بھی دلیل ہوتا ہے اس وجہ سے اس کا ترجمہ یہ ہوگا کہ تم اندھوں کو ان کی گمراہی سے ہٹا کر ہدایت دینے والے نہیں بن سکتے۔

'إِنْ تُسْمِعُ إِلَّا مَنْ يُّؤْمِنُ بِاٰيٰتِنَا فَهُمْ مُّسْلِمُونَ' یعنی تمھاری اس دعوت کا فیض پہنچ سکتا ہے تو انھیں لوگوں کو پہنچ سکتا ہے جو ہماری آیات پر ایمان لانا چاہیں۔ 'يُّؤْمِنُ بِاٰيٰتِنَا' میں فعل ہمارے نزدیک ارادۂ فعل کے معنی میں ہے جس کی مثالیں پیچھے گزر چکی ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ جن لوگوں کے اندر سننے اور سمجھنے کا کوئی ارادہ ہی نہیں پایا جاتا وہ اس نعمت کی کیا قدر کریں گے! 'فَهُمْ مُّسْلِمُونَ' یعنی جن کے اندر سننے سمجھنے کا ارادہ پایا جاتا ہے وہ بے شک ایمان لائیں گے اور اپنے رب کے فرمانبردار بنیں گے۔

ہدایت کے باب میں سنت الٰہی

یہ حقیقت یاد رکھیے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کے اندر طلب ہدایت کا داعیہ ودیعت فرمایا ہے اور سنتِ الٰہی یہ ہے کہ جو لوگ اس داعیہ کی قدر کرتے ہیں ان کے لیے اللہ تعالیٰ ہدایت کی مزید راہیں کھولتا ہے اور اگر کوئی اس داعیہ کی قدر نہیں کرتا تو صرف یہی نہیں ہوتا کہ اس کے لیے مزید ہدایت کے دروازے نہیں کھلتے بلکہ اس کا یہ فطری داعیہ بھی مُردہ ہو جاتا ہے۔ اسی حقیقت کو سیدنا مسیحؑ نے یوں واضح فرمایا ہے

کہ اس سے وہ بھی لے لیا جاتا ہے جو اس کو دیا گیا۔"

وَإِذَا وَقَعَ الْقَوْلُ عَلَيْهِمْ أَخْرَجْنَا لَهُمْ دَابَّةً مِّنَ الْأَرْضِ تُكَلِّمُهُمْ أَنَّ النَّاسَ كَانُوا بِآيَاتِنَا لَا يُوقِنُونَ (۸۲)

قریش کے مطالبہ نشانی عذاب کا جواب

'وَقَعَ الْقَوْلُ عَلَيْهِمْ' سے یہ مراد ہے کہ جب ان کے باب میں اللہ کا فیصلہ صادر ہو جائے گا اور سنتِ الٰہی کے مطابق جس چیز کے وہ مستحق ہیں اس کے ظہور کا وقت آ جائے گا۔

'عَلَيْهِمْ' میں ضمیر کا مرجع قریش ہیں جن سے اس سورہ میں خطاب ہے اور جو مطالبہ کر رہے تھے کہ قرآن ان کو جس عذاب یا قیامت کی خبر دے رہا ہے جب تک وہ ان کو یا ان کی کوئی نشانی دکھا نہ دیں گے اس وقت تک وہ ماننے والے نہیں ہیں۔ ان کے اس مطالبہ کا ذکر آیات ۷۱-۷۲ میں گزر چکا ہے۔

'تُكَلِّمُهُمْ' یہاں اس مفہوم میں ہے جس مفہوم میں سورۂ روم کی آیت ۳۵ میں ہے۔ فرمایا ہے۔

أَمْ أَنزَلْنَا عَلَيْهِمْ سُلْطَانًا فَهُوَ يَتَكَلَّمُ بِمَا كَانُوا بِهِ يُشْرِكُونَ (الروم: ۳۵)

کیا ہم نے اتاری ہے ان پر کوئی دلیل جو شہادت دے رہی ہو ان چیزوں کے حق میں جن کو یہ خدا کی شریک ٹھہراتے ہیں؟

یہاں ظاہر ہے کہ لفظ 'تکلم' اس عام معنی میں نہیں ہے جس معنی میں ہم بولتے ہیں بلکہ اس کا مفہوم کسی چیز کے حق میں دلیل، نشانی یا شہادت ہوتا ہے۔

فرمایا کہ اگر یہ متمردین تمھاری بات اس وقت تک ماننے کے لیے تیار نہیں ہیں جب تک تم ان کو کوئی نشانیٔ عذاب نہ دکھا دو تو اس طرح کی کوئی نشانی دکھا دینا خدا کے لیے ذرا بھی مشکل نہیں ہے۔ وہ ان کو توبہ و اصلاح کے لیے مہلت دے رہا ہے اس وجہ سے اپنے رسول اور اپنی کتاب کے ذریعہ سے ان کو تعلیم و تذکیر اور انذار و تبشیر کر رہا ہے لیکن جب اتمامِ حجت کا یہ وقت گزر جائے گا اور سنتِ الٰہی کے بموجب ان کے لیے عذاب ہی کا فیصلہ ہو جائے گا تو کوئی نشانی ظاہر کر دینے کے لیے خدا کو کوئی اہتمام خاص نہیں کرنا ہے۔ وہ زمین ہی سے کوئی جانور اٹھا کھڑا کرے گا جو اس بات کی شہادت دے دے گا کہ یہ نابکار لوگ اللہ کی آیات پر یقین کرنے والے نہیں ہیں اس وجہ سے قہرِ الٰہی کے مستحق ہیں۔ اس اسلوبِ بیان سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ابھی تو اللہ تعالیٰ آسمان سے اپنی ہدایت نازل فرما رہا ہے اور اپنے رسول اور اپنی کتاب کے ذریعہ سے ان پر حجت تمام کر رہا ہے لیکن ان کی شامتِ اعمال سے اگر ان کی ہلاکت کا فیصلہ ہو ہی گیا تو خدا زمین سے کسی جانور کے ذریعہ سے بھی ان پر شہادت دلوا دے گا۔

رسولوں کی تاریخ میں اس طرح کی نشانی کی ایک مثال ناقۂ ثمود ہے۔ حضرت صالحؑ کی قوم نے جب ان کی بات کسی طرح نہیں مانی اور برابر اس بات پر مصر ہی رہی کہ اس کو کوئی عذاب کی نشانی دی جائے تو حضرت صالحؑ نے ایک اونٹنی نامزد کر دی کہ یہ عذاب کی نشانی ہے۔ اگر تم نے اس کو کوئی گزند پہنچایا تو تم پر

قہرِ الٰہی ٹوٹ پڑے گا چنانچہ جونہی انھوں نے اس کو گزند پہنچایا اللہ کا عذاب ان پر آ دھمکا۔

اس آیت کی یہ تاویل، میرے فہم کے حد تک، قرآن کے الفاظ، نظام اور اس کے نظائر کی روشنی میں بالکل واضح ہے لیکن ہمارے مفسرین اس کے تحت ایک عجیب و غریب 'دآبّۃ' کا ذکر کرتے ہیں جو قیامت کے قریب ظاہر ہوگا۔ میرے نزدیک اس کا تعلق اس آیت سے نہیں بلکہ آثارِ قیامت کی روایات سے ہے۔ ان روایات کو نقدِ حدیث کی کسوٹی پر پرکھ کر دیکھیے۔ اگر وہ اس کسوٹی پر پوری اتریں تو ان کو قبول کیجیے ورنہ رد کر دیجیے۔

یہاں یہ امر بھی یاد رکھیے کہ قریش کو یہ دھمکی جو دی گئی تھی وہ اس شرط کے ساتھ مشروط تھی کہ جب ان کے بارے میں خدا کا فیصلہ ہو جائے گا۔ اگر قریش اپنی ضد پر اڑے رہ جاتے تو ان کو لازماً اسی عذاب سے سابقہ پیش آتا جس کی اس آیت میں وعید ہے لیکن معلوم ہے کہ قریش کی اکثریت آہستہ آہستہ مشرف بہ اسلام ہو گئی اس وجہ سے ان پر اس طرح کا کوئی فیصلہ کن عذاب نہیں آیا جس قسم کا عذاب عاد و ثمود اور دوسری قوموں پر آیا بلکہ ان کے اشرار اہلِ حق کے ساتھ تصادم میں ختم ہو گئے۔

وَيَوْمَ نَحْشُرُ مِنْ كُلِّ أُمَّةٍ فَوْجًا مِّمَّنْ يُكَذِّبُ بِآيَاتِنَا فَهُمْ يُوزَعُونَ (۸۳)

مکذبین کی حالت حشر کے دن

یہ روزِ حشر کی یاد دہانی فرمائی کہ اس دن کو یاد رکھو جس دن اللہ تعالیٰ ہر امت میں سے اپنی آیات کی تکذیب کرنے والوں کی ایک پوری فوج جمع کرے گا اور ان کی درجہ بندی کی جائے گی۔ لفظ 'يُوزَعُونَ' آیت ۱۷ میں گزر چکا ہے اور وہاں ہم اس کی تحقیق کر چکے ہیں۔ یہ درجہ بندی ان کے جرائم کی نوعیت اور ان کی مقدار کے اعتبار سے ہوگی اور پھر جو پارٹی جس درجے کی سزا کی مستحق ہوگی اسی لحاظ سے دوزخ کے الگ الگ وارڈوں میں بھیج دی جائے گی۔ لَهَا سَبْعَةُ أَبْوَابٍ لِّكُلِّ بَابٍ مِّنْهُمْ جُزْءٌ مَّقْسُومٌ (الحجر: ۴۴) (اور دوزخ کے سات دروازے ہوں گے اور ہر دروازے کے لیے ان میں سے ایک معین حصہ ہوگا)۔

لفظ 'فوج' سے ان مکذبین کی کثرت کی طرف اشارہ ہے اور مقصود اس اشارے سے اس حقیقت کا اظہار ہے کہ ان کی کثرت کے باوجود نہ ان کے جمع کرنے میں خدا کو کوئی زحمت پیش آئے گی اور نہ ان کے لیے اس کی دوزخ میں جگہ کی قلت کا کوئی سوال ہوگا۔ وہ ان تمام افواج کو اپنے اندر ہضم کر لے گی اور اس کے بعد بھی 'هَلْ مِن مَّزِيدٍ' پکارے گی۔

حَتَّىٰ إِذَا جَاءُوا قَالَ أَكَذَّبْتُم بِآيَاتِي وَلَمْ تُحِيطُوا بِهَا عِلْمًا أَمَّاذَا كُنتُمْ تَعْمَلُونَ (۸۴)

مکذبین سے ایک سوال

جب یہ سارے مجرمین اکٹھے ہو لیں گے تو اللہ تعالیٰ ان سے سوال فرمائے گا کہ بتاؤ کیا تم نے میری آیات کی تکذیب کی درآنحالیکہ تمہارے علم نے ان کا پورا پورا احاطہ نہیں کیا تھا یا تم کیا بنا تے رہے تھے؟ مطلب یہ ہے کہ اگر تم نے اس روزِ حشر و نشر اور جزاء و سزا کو اس بنیاد پر جھٹلایا ہوتا کہ تمہارے پاس تمام اسرارِ کائنات

کا علم ہے تب تو تمھارا ایک موقف ہو سکتا تھا لیکن اس طرح کا محیط کل علم نہ رکھنے کے باوجود اگر تم نے میری تنبیہات کی تکذیب کی تو اب بتاؤ تمھارے پاس کیا عذر ہے!

اس سے یہ حقیقت واضح ہوئی کہ کسی بات کو تسلیم کرنے کے لیے یہ چیز کافی ہے کہ اس کے دلائل و آثار عقل و فطرت اور آفاق و انفس میں موجود ہیں۔ محض اس بنیاد پر اس کا انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس کے تمام اطراف و جوانب کا ہمارا علم احاطہ نہ کر سکا۔ اگر کوئی شخص اس بنیاد پر اس کی تکذیب کرتا ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ تمام اسرار کائنات کے احاطہ کا مدعی ہے اور یہ چیز نہ کسی کو حاصل ہے اور نہ فاطر کائنات کے سوا کسی کو حاصل ہو سکتی ہے۔ ایسے شخص کی مثال اس احمق کی ہے جو ہمالہ کا انکار اس بنا پر کر دے کہ اس نے اس کی تمام چوٹیوں اور اس کی تمام وادیوں کا مشاہدہ نہیں کیا۔

وَوَقَعَ الْقَوْلُ عَلَيْهِمْ بِمَا ظَلَمُوا فَهُمْ لَا يَنْطِقُونَ (۸۵)

مکذبین کی بے بسی

یعنی اللہ تعالیٰ کے اس سوال کے جواب میں وہ کوئی عذر نہ پیش کر سکیں گے۔ ان کی زبانیں بالکل گنگ ہو جائیں گی اور ان کے اعمال کی پاداش میں ان پر خدا کا فیصلۂ عذاب نافذ ہو جائے گا۔ یہاں بھی وہی 'وَقَعَ الْقَوْلُ' آیا ہے جس پر پیچھے بحث گزر چکی ہے لیکن یہاں روز حشر کا ماجرا بیان ہو رہا ہے اس وجہ سے اس سے اللہ تعالیٰ کا وہ فیصلہ مراد ہے جو ان تمام مجرمین کو جہنم میں جھونک دینے کے لیے ہو گا۔ 'لَا يَنْطِقُونَ' کی وضاحت کے لیے سورۂ یٰسین کی یہ آیت بھی پیش نظر رکھیے۔ 'اَلْيَوْمَ نَخْتِمُ عَلٰٓى اَفْوَاهِهِمْ وَتُكَلِّمُنَآ اَيْدِيْهِمْ وَتَشْهَدُ اَرْجُلُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ' (۶۵) (آج ہم ان کے مونہوں پر مہر لگا دیں گے اور ان کے اعمال سے متعلق ان کے ہاتھ ہم سے باتیں کریں گے اور ان کے پاؤں گواہی دیں گے)۔ اس آیت میں 'تُكَلِّمُنَا' بھی قابل توجہ ہے جس پر پیچھے بحث گزر چکی ہے۔

اَلَمْ يَرَوْا اَنَّا جَعَلْنَا الَّيْلَ لِيَسْكُنُوْا فِيْهِ وَالنَّهَارَ مُبْصِرًا ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ (۸۶)

اس آیت میں، عربیت کے معروف اسلوب کے مطابق، متقابل الفاظ محذوف ہیں۔ پہلے ٹکڑے میں 'مظلما' حذف ہے اور دوسرے ٹکڑے میں 'تتقلبوا' یا اس کے ہم معنی کوئی لفظ۔ اس ایجاز کی بلاغت کی وضاحت اس کے محل میں ہو چکی ہے۔

فعل 'يُؤْمِنُوْنَ' یہاں ارادۂ فعل کے مفہوم میں ہے۔

عذاب کی نشانی مانگنے والوں کو ملامت

یہ نشانی عذاب کا مطالبہ کرنے والوں کو ملامت ہے کہ آخر یہ محروم القسمت لوگ عذاب ہی دیکھنے کے لیے کیوں اڑے ہوئے ہیں؟ اس کائنات کی نشانیوں پر کیوں نہیں غور کرتے! کیا ان کو ہماری ہر روز ظاہر ہونے والی یہ عظیم قدرت و حکمت نظر نہیں آتی کہ ہم نے رات کو تاریک و پرسکون بنایا تاکہ وہ اس میں سکون و راحت حاصل کریں اور دن کو روشن بنایا تاکہ وہ اس میں کام کریں! 'اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ'

اس میں ایک ہی نہیں بلکہ بہت سی نشانیاں موجود ہیں لیکن یہ نشانیاں ان لوگوں کو نظر آسکتی ہیں جن کے اندر ایمان لانے کا ارادہ پایا جاتا ہو۔

شب و روز کی یکے بعد دیگرے آمد و شد، تضاد کے باوصف ان کے توافق اور خلق کے لیے ان کی نفع رسانی سے اس کائنات کے خالق کی قدرت، حکمت، ربوبیت، توحید اور حشر و نشر پر قرآن نے جو دلیلیں قائم کی ہیں ان کی وضاحت جگہ جگہ ہو چکی ہے۔ یہاں لفظ 'اٰیٰتٍ' سے اجمالی اشارہ ان سب کی طرف ہے لیکن موقع و محل کے تقاضے نے خاص طور پر قیامت اور حشر و نشر کی طرف توجہ دلاتی ہے کہ اس کا مشاہدہ تو اس دنیا میں ہر روز کر رہے ہو جس طرح تم رات میں ہر روز سوتے ہو اور پھر صبح کو اٹھ بیٹھتے ہو اسی طرح مرنے کے بعد ایک وقت آئے گا کہ اٹھ بیٹھو گے۔ خدا ہر چوبیس گھنٹوں میں یہ مشاہدہ اسی لیے کرا رہا ہے کہ اصل حقیقت کی یاددہانی تمھیں ہر روز ہوتی رہے لیکن جو لوگ کسی بات کو ماننا ہی نہ چاہیں ان کی ہٹ دھرمی کا کیا علاج! سورۂ فرقان کی آیت ۴۷ میں اس حقیقت کی طرف یوں توجہ دلاتی ہے۔

وَهُوَ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الَّيْلَ لِبَاسًا وَّالنَّوْمَ سُبَاتًا وَّجَعَلَ النَّهَارَ نُشُوْرًا (الفرقان: ۴۷)

اور وہی ہے جس نے تمھارے لیے شب کو پردہ پوش، نیند کو دافع کلفت اور دن کو وقت نشور بنایا۔

اور اسی کی تذکیر وہ دعا کرتی ہے جو سو کر اٹھنے کے وقت کے لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے تلقین فرمائی ہے۔

وَيَوْمَ يُنْفَخُ فِي الصُّوْرِ فَفَزِعَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ اِلَّا مَنْ شَآءَ اللّٰهُ ۭ وَكُلٌّ اَتَوْهُ دٰخِرِيْنَ (۸۷)

ہول قیامت کی یاددہانی

یہ قیامت کے ہول کی یاددہانی فرمائی ہے کہ اس کو کوئی آسان چیز نہ سمجھو۔ جب صور پھونکا جائے گا تو اس کے ہول سے سب گھبرا اٹھیں گے۔ 'اِلَّا مَنْ شَآءَ اللّٰهُ' صرف وہی لوگ اس دن کی ہلچل سے مامون رہیں گے جن کو اللہ اس سے مامون رکھے۔ اس اجمال کی وضاحت آگے آیت ۸۹ میں بدیں الفاظ ہوئی ہے۔ 'مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ خَيْرٌ مِّنْهَا ۚ وَهُمْ مِّنْ فَزَعٍ يَّوْمَئِذٍ اٰمِنُوْنَ' (جو نیکی کا توشہ لے کر آئیں گے ان کے لیے اس سے بہتر صلہ ہوگا اور وہ اس دن ہر گھبراہٹ سے بالکل مامون ہوں گے) 'وَكُلٌّ اَتَوْهُ دٰخِرِيْنَ' یعنی بڑے چھوٹے اور لیڈر، پیرو سب اس دن خدا کے حضور میں نہایت ذلت کے ساتھ حاضر ہوں گے۔ 'دٰخِرِيْنَ' کے معنی 'صٰغِرِيْنَ' کے ہیں۔ اس ذلت سے صرف وہی لوگ محفوظ رہیں گے جن کی طرف اوپر اشارہ ہو چکا ہے۔

وَتَرَى الْجِبَالَ تَحْسَبُهَا جَامِدَةً وَّهِيَ تَمُرُّ مَرَّ السَّحَابِ ۭ صُنْعَ اللّٰهِ الَّذِيْٓ اَتْقَنَ كُلَّ شَيْءٍ ۭ اِنَّهٗ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَفْعَلُوْنَ (۸۸)

یہ اس دن کے ہول کی مزید تفصیل ہے کہ دوسری چیزوں کا تو کیا ذکر اس دن پہاڑوں کا بھی یہ حال ہوگا کہ

بظاہر ٹھگے ہوئے نظر آئیں گے حالانکہ وہ بادلوں کی طرح اڑتے ہوئے ہوں گے۔ یہاں یہ بات یاد رہے کہ شعرائے عرب میں جو حکیم تھے ان تک کا حال یہ تھا کہ وہ دوسری تمام چیزوں کو تو فانی مانتے تھے لیکن پہاڑوں کو غیر فانی سمجھتے تھے۔ 'صُنْعَ اللّٰهِ الَّذِیْٓ اَتْقَنَ كُلَّ شَیْءٍ' یہ اسی طرح کی ترکیب ہے جس طرح 'وَعْدَ اللّٰهِ'، 'صِبْغَةَ اللّٰهِ' وغیرہ ترکیبیں قرآن میں ہیں۔ یہ اسلوب اس وقت اختیار کیا جاتا ہے جب کسی شے کی طرف خاص طور سے توجہ دلانا ہو۔ مطلب یہ ہے کہ یہ اس خدا کی کاریگری ہوگی جس نے ہر چیز کو محکم کیا ہے۔ جب اسی نے ہر چیز کو محکم کیا ہے تو وہ یہ بھی کر دکھائے گا کہ پہاڑ جمے ہوئے بھی نظر آئیں گے اور وہ ہوا میں اڑتے ہوئے بھی ہوں گے۔

'اِنَّهٗ خَبِیْرٌۢ بِمَا تَفْعَلُوْنَ' یہ اس اصل چیز کا بیان ہے جس سے آگاہ کرنے کے لیے قیامت کے اس ہول کی تفصیل سنائی گئی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اس دن اس کائنات میں ہلچل کا حال یہ ہوگا اور اللہ تمھاری اس ساری کرتوت سے اچھی طرح باخبر ہے جو تم کر رہے ہو اور جب واقف ہے تو لازماً وہ اس کی جزا و سزا بھی دے گا۔

مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ خَیْرٌ مِّنْهَا ۚ وَهُمْ مِّنْ فَزَعٍ یَّوْمَئِذٍ اٰمِنُوْنَ ۝ وَمَنْ جَآءَ بِالسَّیِّئَةِ فَكُبَّتْ وُجُوْهُهُمْ فِی النَّارِ ؕ هَلْ تُجْزَوْنَ اِلَّا مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ (۸۹-۹۰)

یہ اوپر والے ٹکڑے 'اِنَّهٗ خَبِیْرٌۢ بِمَا تَفْعَلُوْنَ' کا لازمی نتیجہ بیان فرمایا ہے کہ جو نیکی کما کر اس دن حاضر ہوں گے ان کے لیے تو بہترین صلہ ہوگا اور وہ اس دن کی گھبراہٹ سے بالکل مامون اور بے فکر ہوں گے لیکن جو لوگ بدی کی کمائی کر کے آئیں گے تو وہ اوندھے منہ جہنم میں جھونک دیے جائیں گے کہ یہ تمھارے اعمال ہی کا بدلہ ہے جو تمھیں مل رہا ہے۔ تمھارے ساتھ کوئی ناانصافی نہیں کی جا رہی ہے۔

اِنَّمَآ اُمِرْتُ اَنْ اَعْبُدَ رَبَّ هٰذِهِ الْبَلْدَةِ الَّذِیْ حَرَّمَهَا وَلَهٗ كُلُّ شَیْءٍ ؗ وَّاُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ ۝ وَاَنْ اَتْلُوَا الْقُرْاٰنَ ۚ فَمَنِ اهْتَدٰی فَاِنَّمَا یَهْتَدِیْ لِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ ضَلَّ فَقُلْ اِنَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُنْذِرِیْنَ (۹۱-۹۲)

آنحضرتؐ کے مشن کی وضاحت

یہ آخر میں اللہ تعالیٰ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے آپؐ کے مشن اور مقصد دعوت کی بالکل فیصلہ کن انداز میں وضاحت کرا دی تاکہ قریش اگر سنبھلنا چاہیں تو سنبھل جائیں ورنہ نتائج بھگتنے کے لیے تیار ہو جائیں۔

ہمارے نزدیک یہاں 'اِنَّمَآ اُمِرْتُ' سے پہلے لفظ 'قُلْ' برنبائے قرینہ محذوف ہے۔ بعد میں اس کی وضاحت ہو گئی ہے چنانچہ فرمایا ہے 'فَقُلْ اِنَّمَآ اَنَا الآیۃ' اور 'قُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ'۔

فرمایا کہ ان لوگوں کو صاف صاف سنا دو کہ مجھے تو یہ ہدایت ہوئی ہے کہ میں اس سرزمین کے اس رب کی بندگی کروں جس نے اس کو محترم ٹھہرایا اور جس کے اختیار ہی میں سب کچھ ہے اور یہ کہ میں اسی کی اطاعت کرنے والوں میں سے ہوں۔ یہ اجمالی اشارہ ہے سرزمین مکہ اور بیت اللہ کی تاریخ کی طرف کہ جس مقصد کے لیے اللہ تعالیٰ نے اس سرزمین کو منتخب فرمایا اور اس کو محترم ٹھہرایا میں اسی مقصد کے احیاء و تجدید

کے لیے مبعوث ہوا ہوں اس وجہ سے تم لوگ میری مخالفت میں خواہ کتنا ہی زور لگاؤ لیکن اس سے کوئی مجھے پھیر نہیں سکتا۔ یہ سرزمین ملتِ ابراہیم کا مرکز ہے اس وجہ سے میری دعوتِ توحید ہی وہ اصل کام ہے جو یہاں ہونا چاہیے اور میں وہی کام کر رہا ہوں۔ 'وَلَهٗ كُلُّ شَيْءٍ' یعنی یہاں اس گھر کے رب کے سوا دوسروں کی جو پرستش ہو رہی ہے یہ بالکل ناروا ہے۔ میں ان کی پرستش سے بری ہوں۔ 'وَاُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ' یعنی جس طرح مجھے اس گھر کے رب ہی کی عبادت کا حکم ہوا ہے اسی طرح اس بات کی بھی ہدایت ہوئی ہے کہ میں صرف اسی کی اطاعت کرنے والوں میں سے بنوں، اس کے سوا کسی اور کی اطاعت نہ کروں۔

'وَاَنْ اَتْلُوَا الْقُرْاٰنَ الاٰيَة' یعنی تم لوگ مجھے زچ کرنے کے لیے جو نت نئے مطالبات کر رہے ہو مجھے ان سے کوئی سروکار نہیں ہے مجھے صرف یہ ہدایت ہوئی ہے کہ میں یہ قرآن تم کو سناؤں تو جو اس کو سنے گا اور اس سے ہدایت حاصل کرے گا اس کا فائدہ اسی کو حاصل ہوگا اور جو اس کے بعد بھی اپنی گمراہی پر جما رہ جائے گا وہ اس سے مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔ میں تو بس ایک منذر ہوں۔ آگاہ کر دینے کے بعد میری ذمہ داری ختم ہو جاتی ہے۔ یہاں سیدنا ابراہیمؑ کی اس دعا پر بھی نگاہ رہے جو انھوں نے ذریتِ اسماعیل کے اندر ایک رسول کی بعثت سے متعلق فرمائی تھی۔ اس میں بھی مبعوث ہونے والے رسول کا خاص کام 'يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ' بتایا گیا تھا۔ مطلب یہ ہے کہ جس کام کے لیے اس مرکزِ توحید کے بانی نے دعا فرمائی تھی میں اس کارِ خاص پر مامور ہوا ہوں اور وہی کام کر رہا ہوں۔ اب جو اپنی بھلائی چاہتا ہے وہ اس برکت میں شریک ہو ورنہ اپنے انجام کا انتظار کرے۔

وَقُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ سَيُرِيْكُمْ اٰيٰتِهٖ فَتَعْرِفُوْنَهَا ؕ وَمَا رَبُّكَ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ (۹۳)

یعنی ان سے کہہ دو کہ اللہ ہی شکر کا سزاوار ہے جس نے مجھ پر قرآن کی یہ نعمت اتاری اور میں وہ تم کو سنا رہا ہوں۔ اگر تم اس کی قدر نہیں کر رہے ہو اور مجھ سے نشانیوں کا مطالبہ کر رہے ہو تو وہ وقت بہت جلد آ رہا ہے جب وہ تمھیں اپنی نشانیاں دکھائے گا اس وقت تمھیں پتہ چلے گا کہ میں نے تمھیں کتنی سچی باتیں بتائی تھیں لیکن تم نے اپنی بدبختی سے ان کی قدر نہیں کی۔ 'فَتَعْرِفُوْنَهَا' یعنی اس وقت تم جانو گے کہ کسی نے آج اس انجام سے تمھیں آگاہ کیا تھا لیکن تم نے اس کو جھٹلایا اور اپنی یہ شامت بلائی۔ مگر اس جاننے کا کوئی فائدہ نہیں ہو گا۔

'وَمَا رَبُّكَ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ' یعنی اس غلط فہمی میں نہ رہو کہ تم جو شرارتیں کر رہے ہو خدا اس سے بے خبر ہے۔ وہ ہر چیز سے باخبر ہے اور تمھاری خبر لے گا لیکن اس کے ہاں ہر چیز کا ایک وقت مقرر ہے۔

ان سطروں پر اس سورہ کی تفسیر اللہ تعالیٰ کی توفیق سے انجام کو پہنچی۔ فالحمد للہ علی ذالک۔

رحمان آباد

۲۱ رفروری ۱۹۷۴ء